دِلّی کا سنبھالا

خواجہ محمد شفیع (دہلوی)
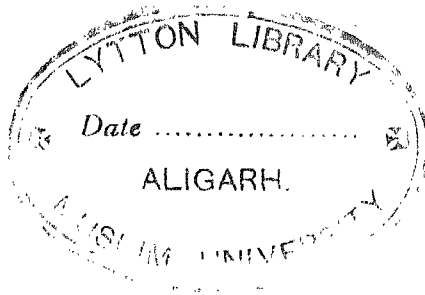
مکتبہ جامعہ دہلی

قیمت عہ

طبع دوم ایک ہزار
مطبوعہ جید برقی پریس۔ دہلی
اکتوبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

پہلے تیس صفحے اور صفحہ اکتالیس آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے واسطے لکھے گئے اور ان کی اجازت سے شائع ہوئے

فہرست مضامین

پہلے تیس صفحے اور صفحہ اکتالیس آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے واسطے لکھے گئے اور ان کی اجازت سے شائع ہوئے

نذر

۱۸۵۷ء کی دلی کو

آرزو

دعائے خیر

خواجہ محمد شفیع ٹیا محل دہلی

دِلّی کا سنبھالا

تمہارا اُٹھ کے جانا تھا مریضِ غم کا مر جانا
مری جاں فرق ہوتا ہے سنبھلنے اور سنبھالے میں

جو پیدا ہوا اُس کو مرنا ہے۔ ہر شے کے لئے فنا بقا ہے بس اس ذاتِ لایزال کو

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
زجامِ دہر مے کُل من علیہا فان

عناصر جدا ہونے سے پہلے ساتھ نہ چھوڑنے کی جان توڑ کوشش کرتے ہیں اور پھر دم توڑ دیتے ہیں۔ مرنے والے کی اس آخری سعیِ نیست کو سنبھالا کہا جاتا ہے۔

قحط الرجال شہر کی موت ہے جب تک گود سپوتوں سے بھری ہے شہر زندہ ہے۔ گود خالی ہوئی اور وہ ختم۔ نونہال زینت وہ

چمن نہ رہے، چمن اجڑ گیا۔ شہر مر گیا۔ دلی ایک شہر تھا عالم میں انتخاب۔ جب اس کا وقت آیا وہ بھی نہ رہا۔ ہاں ختم ہونے سے پہلے اس سرزمین نے ایسے ایسے لال اگلے اور وہ وہ گلہائے سرسبد اُگائے جن کا ہر دانہ تاج شاہی کے قابل اور ہر پھول درخورِ طرۂ و دستار تھا

خواجہ کیا داستانِ غم لیکر بیٹھا ہے، کیوں بھولے ہوئے دکھڑے یاد دلاتا ہے۔

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانہ مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

اچھا خفا نہ ہوجیے، مطربِ مزاج داں نغمۂ جانگداز سے پہلے زمزمۂ رقص آور چھیڑتا ہے۔ ساز کو تنت پر بجانے سے پہلے چلت پھرت کی گت

نذر ہے۔

کیوں صاحب افسانۂ غم داستان عیش سے بدل جائے تو کیسا مجلس عزاداری محفل مولود بن جائے تو کیا خوب۔ مرگِ دہلی کا ذکر ہوتا رہے گا، مولودِ دہلی کا تذکرہ سنئے۔

صاحب سنی سنائی بات ہے، بڑوں نے کہی ہمارے کان پڑی، آپ تک پہنچادی۔ پانچ پت آباد ہوئے، چار کا پتہ چلتا ہے۔ پانچویں کا نشان نہیں ملتا۔ پانی پت، سونی پت، ماریت، باگ پت خیال ہے کہ پانچواں پت جولاپتہ ہے۔ دلی بن گیا۔ راجہ انگ پال۔ اس راج دھانی میں راج راج رہا تھا کہ فرشتۂ اجل نے فرمان قضا دیا۔ اولاد نرینہ نہ تھی، نواسہ پرتھوی راج جو اجمیر کا راجہ تھا وارثِ تاج و تخت ہوا۔

ہندوؤں کا ستارہ شہاب الدین کے ہاتھوں غروب ہوا۔ پرتھوی راج مارا گیا۔ مسلمانوں کا نیّر اقبال چمکا۔ عروسِ سلطنت شہاب الدین سے ہم آغوش ہوئی۔ ع کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی۔ ع عطارد قلم در سیاہی نہاد۔ شہاب الدین شہاب ثاقب ہوا۔ اس کا سپہ سالار قطب الدین تخت نشین۔

انجام کار قطب الدین بھی افق فنا میں غروب ہوتا ہے اور اس کا داماد شمس الدین التمش آفتاب جہاں تاب بن کر چمکتا ہے۔ وہ لے تا بکے۔ چند روز چمک دمک دکھا کر بالآخر غرب مرگ میں غروب ہوا۔ لڑکا آرام شاہ اسم با مسمیٰ تھا۔ چندے رنگ رلیوں میں رہا۔ زمانہ نے رنگ بدلا، نیرنگ فلک رنگ لایا۔ حکومت کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ اس کی بہن رضیہ سلطانہ کے ہاتھ میں عنانِ سلطنت آئی ادبار کی کچھ ایسی کالی گھٹا چھائی کہ سفلہ نوازی کے ہاتھوں سیہ بختی سے دوچار ہوئی اور حکومت ہاتھ سے گنوائی۔

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

رفت و منزل بدیگرے پرداخت

کےؔقباد نے کیلوکھڑی آباد کی جو آج تلوکھڑی کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ انجام کار کےؔقباد سازشوں کا شکار ہوا اور اس کا سپہ سالار جلال الدین خلجی تخت پر بٹھایا گیا۔ یہ مردِ خدا ان سازشوں میں شامل نہ تھا وہ لے قرعۂ فال اس کے نام پڑا۔ اس نے گوارا نہ کیا کہ جس تخت پر اس کے آقا بیٹھے تھے اسی پر یہ بھی بیٹھے۔ پس ایک اور شہر کی بنا

ڈالی۔ یہ تلوکھڑی کے قریب ہے۔

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر
پسراں را ہمہ بدخواہِ پدر می بینم

میدانِ کارزار آراستہ ہوا، بھتیجا چچا کے خلاف کمربستہ جواں ہمت۔ جواں بخت علاؤالدین بڑے چچا کو مار کر تخت نشین ہوا دلی کی داغ بیل ڈالی اور قطب مینار کی طرح۔ خسرو شاہ غاصب غیاث الدین کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا۔ غیاث الدین برسرِ اقتدار آیا۔ غیاث پور آباد کیا، حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے منھ آیا، منہ کی کھائی، بیٹے محمد تغلق نے یہ آفت ڈھائی کہ باپ کے سر پر مکان کی چھت گرائی اور وہ نمرود اس میں دب کر رہ گیا۔ جب یہ واقعہ ہو رہا تھا حضرت سلطان جی محبوب الٰہیؒ ٹہل رہے تھے اور بار بار زبان مبارک پر یہ شعر آتا تھا۔

اے گربہک چرا نہ نشینی بجائے خویش   با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

فیروزشاہ نے اپنی دہلی الگ بسائی، کوٹلہ فیروزشاہ، کلاں مسجد اور پرانی عیدگاہ یادگار چھوڑ گیا۔

وقت کوتاہ و قصہ طولانی، انجام کار نوبت شاہجہاں رسید

یہ شہر رسا بسا، یہ پودا پھلا پھولا، یہ بچہ پروان چڑھا اور کچھ ہوا ایسی موافق آئی کہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ بحرِ حیات میں بادِ مخالف بھی چلی، بادِ شرطہ بھی، طوفانِ حوادث نے کشتی کو ڈگمگا دیا۔ ملاح امید چھوڑ بیٹھے، پر قسمت نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بادِ فنا دل میں ٹھانے تھی کہ آج اس بیڑہ کو ڈبو کر چھوڑوں گی۔ قسمت نے بیڑا اٹھایا تھا کہ بیڑہ پار لگاؤں گی، کالی گھٹائیں آسمان پر چھائیں۔ برسیں بھی برسایا بھی۔ پر ہر سیلِ بلا کے بعد اس نے وہ جوبن نکھارا کہ باید و شاید۔ جسے وہ رکھے اسے کون چکھے۔ افتادیں بھی پڑیں۔ کھکھیڑیں بھی بھگتیں جھٹکے بھی لگے، پر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ بلائیں آئیں۔ بلا گرداں کیا۔ خیر خیرات دی۔ صدقہ کیا کوئی آفت آئی مکان بدلا۔ لیجئے آئی ٹل گئی نادر بلائے بے درماں کی طرح آیا۔ نوا نذر نذر پکڑائے، ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ تختِ طاؤس دے کر پنڈ چھڑایا۔

۱۸۵۷ء کی بلا اس مریض نیم جاں کو بے جان کئے بغیر نہ ٹلنی تھی نہ ٹلی۔ ایک آفت ہوتی تو بھگت لی جاتی، یہاں تو مصیبت نے گھر گھیر رکھا تھا۔ ایک سے چھٹکارا نہ ملتا تھا کہ دوسری پڑتی تھی۔

ایک آفت سے تو مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

یہاں جینے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ دستِ قضا دستِ تاراج دراز کرتا تھا۔ بقول غالب۔

"پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے، چوتھا لشکر ہیضہ کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے، پانچواں لشکر تپ کا۔ اس میں تاب و طاقت عموماً لٹے مرے آدمی کم۔ لیکن جس کو تپ آئی اس نے اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں۔"

خواجہ جلدی کر سوانگ باقی بہت ہے، شب کم ہے۔ قصہ کوتاہ دلّی لٹی، دلی والے خانماں خراب ہوئے، نوجوان مارے گئے، بڈھے ٹھڈے شہر چھوڑ کر بھاگے جس کا جہاں سینگ سمایا جا چھپا، اکثر مارے گئے، بہت شہر بدر ہوئے، دلّی والے کا دلی میں ٹھکانا نہ تھا۔ جو بھاگ نکلا بچ گیا، جو رہ گیا مارا گیا۔

ع۔ جیسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے ۔ اس گئے گذرے زمانہ میں اس طوائف الملوکی کے عالم میں۔ اس سرزمین نے ایسی ایسی زندہ جاوید ہستیاں پیدا کیں جو آجتک چشم وچراغ ہندوستان ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اللہ اللہ کیا کیا دماغ ہوں گے جو تلوار کے گھاٹ اتر گئے۔ جو اس طوفان بلا سیل حوادث کے ہاتھ سے بچے وہ بھی اتنے ہیں کہ آجتک کسی شہر نے بیک وقت اتنے صاحب کمال پیدا نہ کئے ہوں گے۔

ع دردے وسخت دردے کارے وسخت کارے۔ وہ صورتیں نہ رہیں، ان کے دیکھنے والے بھی مر کھپ گئے۔

ع۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند۔ وہ صحبتیں نہ رہیں، وہ دور ختم ہو گیا۔ محفلوں کو جگا دینے والے، دماغ تہ خاک جا سوئے باغ اجڑ گیا داستان گل و بلبل طے ہو گئی۔ ہم آج ان ناموں کو ڈھونڈنے بیٹھے ہیں جو ہمیشہ کے واسطے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ جن کی یادیں فراموش ہو گئیں، جن کا نشانِ مزار بھی نہ رہا۔

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہر کیف کھوج لگائیں گے، پتہ چلائیں گے اور جو بھی مل گئے ان کو انشاء اللہ آپ سے لا ملائیں گے۔

یہ کون جوگن رمنا رمائے بیٹھی ہے۔ ع سینہ میں یاس و حسرت و حرماں لئے ہوئے۔ ع۔ بال بکھرے ہوئے زلفوں کے ادھر اور اُدھر شاہانہ شان بشرہ سے عیاں، پر چہرہ پر کچھ ہوائیاں سی اُڑ رہی ہیں۔
ع۔ اور غم کے ہاتھوں اس کی اتری ہوئی سے صورت۔
چشم مے گوں میں آنسو چھلک رہے ہیں، رنگ و روپ کچھ بدرنگ سا

نظر آتا ہے۔

زلفیں الجھ رہی ہیں ہے سوگوار حالت

افشاں اڑی ہوئی ہے رنگ حنا کی صورت

ہونٹوں پر لاکھا ہے کچھ اڑا اڑا آنکھوں میں سرمہ ہے پر پھیکا پھیکا

حسرت کی کشمکش میں حیران ہو رہی ہے۔ خانہ خرابیوں سے ویران ہو رہی ہے

جوگن جی دربار جمائے بیٹھی ہیں، پر دربار کچھ ادبار زدہ سا معلوم ہوتا ہے

نقیب سیاہ پوش مجمر آتش در دروں عود سوز سینہ سوزاں

شمع اشک فشاں، لالہ داغ در دل۔ بوئے گل پریشان، صراحی سر بریدہ

جام میں دیدۂ تر جھلک رہا ہے۔

آیئے ذرا قریب سے دیکھیں یہ کون دیوی جی ہیں جو جوگن کے

سروپ میں درس دے رہی ہیں اوہو یہ تو دلی ماتا ہیں، ان پر کیا بپتا

پڑی جو بھرا پُرا گھر چھوڑ دھن دولت تج، جوگن کا برن لے جنگل آن بسایا

ماتا جی شہر کیوں چھوڑا، گھر بار سے منھ کیوں موڑا، آبادی سے

من کیوں گھبرایا۔ ویرانہ جی کو کیوں بھایا

دلی ماتا نے آنکھ اٹھائی۔ دلِ پُر درد سے آہِ سرد کھینچی۔ اور کہا
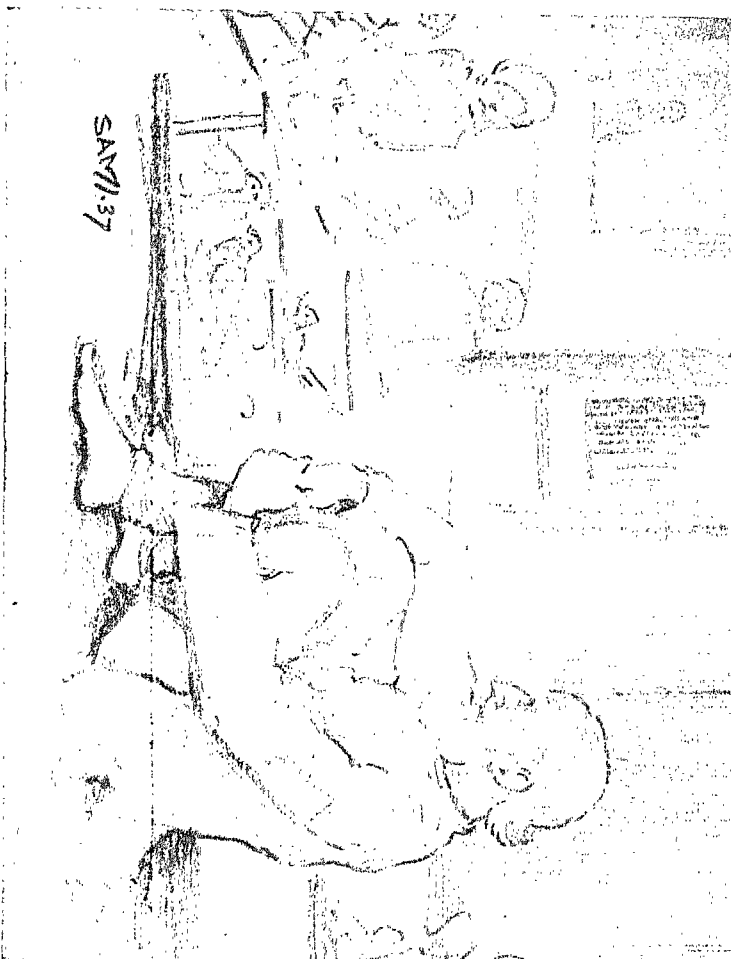
مرزا فخرو عرف مرزا چپاتی

بن ماں کیسا مالوا۔ اور بن پی کیا سسرال۔ میرا سہاگ اُجڑ گیا، میرا پی مجھ سے بچھڑ گیا۔ میری دنیا بدل گئی، مجھ سے زمانہ نے آنکھیں پھیر لیں، میرے لال خاک میں مل گئے، میرا سائیں دیس بدر ہو گیا۔ ع
اب شان کہاں باقی ہم شان لٹا بیٹھے ۔ اتنا کہنا تھا کہ آواز بھرّا گئی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ع بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانئے کیا یاد آیا ۔ پھر سرنگوں ہو بیٹھی،

درباری آنے شروع ہوئے، دربار جمنے لگا۔ یہ کون سجیلا جوان ہے۔ بلند بالا ورزشی بدن۔ چوڑی ہڈی، رنگ سرخ و سپید۔ ذرا آنکھ تو دیکھو، خون کبوتر معلوم ہوتی ہے

ستو بھاٹ کیا کہتا ہے۔ مرزا فخرو عرف مرزا چپاتی، شاہی خاندان سے ہیں۔ جوگن نے یہ نام سنکر سر اٹھایا۔ اور مرزا صاحب موصوف کی طرف ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔ اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست شہزادوں اور سلاطین کا یہاں کچھ کام نہیں۔ آج صرف صاحب کمال پیش کئے جائیں، اگر ان میں بھی کوئی کمال ہے تو جگہ دی جائے ورنہ ان کی گنجایش نہیں۔ بھاٹ نے دست بستہ مؤدّبانہ عرض کی۔

خانہ زاد گوش گذار بارگاہ خداوندی کرتا ہے کہ حسب الحکم اعلان عام کردیا گیا ہے کہ آج صرف صاحب کمال آئیں اور کوئی آنے نہ پائے آج جو بھی شرف باریابی حاصل کرے گا کسی نہ کسی علم یا فن کا کامل ہوگا۔ اجازت ہو تو حلقہ بگوشِ بارگاہِ عالی مرزا صاحب کے حالات عرضِ خدمت کرے، اشارہ ہوا، اچھا کہو۔

غدر کے بعد جب دہلی والے بھوکوں کے مارے دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے، اس نفسی نفسی کے زمانہ میں اس مرد خدا نے لنگر جاری کر رکھا تھا، جب دنیا دانہ دانہ کو ترس رہی تھی، اس کے دروازہ پر دیگیں چڑھی رہتی تھیں۔ اور سخاوت کا بازار گرم۔ حلوہ چپاتی عام تقسیم ہوتا تھا۔ اس وجہ سے عوام میں مرزا چپاتی مشہور ہو گئے۔ دلّی میں امن و امان ہو گیا، کاروبار کا بازار گرم مفلس تونگر ہو گئے اور یہ تونگر تہی دست اس وقت "تکل" بنانے والا ان سے بہتر نہیں ہے۔ ان کے مقابلہ کا پیراک تمام ہندوستان میں نہیں۔

کبوتر بھی لاجواب بناتے ہیں، ان کے کبوتروں کی یہ خصوصیت ہے کہ کسی گھر کے گردان نہیں ہوتے، ٹھیلے میں بند رہتے ہیں۔ جس گلی

کوچہ میں چاہتے ہیں اپنا ٹھیلا لے جاتے ہیں۔ اور کبوتر اڑانے شروع کر دیتے ہیں۔

یہ سن کر دلی نے منجم قدرت جو حاضر دربار تھا اس کی طرف آنکھ اٹھائی اور کہا یہ وہ مرزا فخرو ہیں جو گیارہ برس کی عمر تک گودوں میں پھرے ہیں۔ بتاؤ ان کا انجام کیا ہوگا۔

زمانہ بر سرِ پرخاش ہے۔ گیارہ برس کی عمر تک گودیوں میں چڑھے پھرنے کا کفارہ ان کو بڑھاپے میں ادا کرنا پڑے گا۔ یہ نازوں کا پالا زمین کا گز بنے گا۔ روزانہ بائیس چوبیس میل پھرنا مقدر ہے۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کبوتر اور گڈیاں بیچتا ہوا مرے گا۔ زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ جس کے دروازہ پر حُسن برستا تھا کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگا۔ غدر کے زمانہ میں سینکڑوں بھوکوں کا پیٹ پالنے والا خود فقرہ فاقہ میں گذر کر کے خراب و خستہ جہانِ گذران سے گذر جائے گا۔

یہ ہے ان کا اندوہناک مستقبل۔

دلی ماتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی اور مرزا چپاتی کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ دل ہاتھوں سے

نکلا جاتا تھا کہ عین نِرت[1] پر دور سے ستار کی آواز سنائی دی، نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک سانولے رنگ کا آدمی، مغل آنکھوں والا چہرہ سے جاہ و جلال کے آثار نمودار، اپنی دھن[2] میں بیٹھا ستار بجا رہا ہے، بھاٹ نے مرزا کالے لقب بتایا، بہادر شاہ آخری تاجدار ہند کا قریبی رشتہ دار اور فن ستار نوازی کا استاد بے بدل۔ جوگن جی منجم قدرت کی طرف مخاطب ہوئیں اور کہا، بتاؤ فلکِ فتنہ سازان سے کیا راگ لائے گا۔ طالع فرمان منجم نے زائچہ دیکھا اور عرض کی، زمانہ کے ہاتھوں بری گت[3] بنے گی، جو فن ہاتھ میں ہے۔ اس کی بدولت ٹکڑا کما کھائیں گے، بارگاہِ عالی سے ارشاد ہوا مفصّل بیان کرو، خادم مزاج داں نے دست بستہ عرض کی، داستان دردناک ہے اور نغمہ جاں گداز اسے نہ چھیڑیں تو بہتر۔ حکم صادر ہوا ہم سنّا چاہتے ہیں داستان بے کم و کاست بیان کی جائے۔ منجم ازل نے زبانِ پردہ[4] در کھولی اور کہا، میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک جوگی بیروگی بھبوت ملے گیروا کپڑے

---

[1] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے [2] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے

[3] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ [4] ستار کے ایک حصہ کا نام ہے

پہنے گوالیر دربار میں کھڑا ہے، ستار جان کے ساتھ ہی حکم ہوتا ہے۔ کچھ چھیڑو۔ دربار کا ستار نواز دست بستہ عرض کرتا ہے کہ اگر اجازت ہو تو پہلے خانہ زاد پیش کرے۔ اشارہ ہوتا ہے اچھا تو شروع کرو۔ صاحب کمال ہے کمال دکھاتا ہے۔ وہ وہ تان[1] پلٹے[2] لیتا ہے۔ ایسے ایسے سوت[3] بینڑھ[4] کھینچتا ہے کہ باید و شاید۔ محفل پر جادو سا کر دیتا ہے، کچھ ایسا رنگ جماتا ہے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے ہیں، صاحب نظر جان جاتے ہیں کہ اب کالے خاں کا رنگ جمتا دکھائی نہیں دیتا۔ جب وہ ختم کرتا ہے تو کالے خاں کو حکم ہوتا ہے۔ جو چیز اس نے شروع کی تھی۔ وہی یہ بھی چھیڑتا ہے، صاحب فہم دیوانہ سمجھتے ہیں جانتے ہیں کہ بھلا اس میں کیا عہدہ برآ ہو سکتا ہے، اس موسلے کے آگے اس میراثی کا سحر ساحری نہیں چلتا، چاند کے سامنے مہ نخشب نہیں ٹکتا، آن کی آن میں محفل کو مسخر کر لیتا ہے، جو انگ اس میراثی نے دکھائے تھے وہ سب پیش کرتا ہے اور پھر اپنا راستہ الگ نکالتا ہے، نئے سوت نرالی

---

[1] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ [2] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔
[3] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے
[4] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے

بینڈ ہیں۔ انوکھا انگ، نرالا رنگ، زمانہ کی آنکھیں دیکھا ہوا میراثی اس
نام نہاد کالے خاں کی آنکھوں کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ مغلیہ آنکھ شاہانہ
سج دہج نظر آتی ہے، تاڑ جاتا ہے۔ دست بستہ عرض کرتا ہے، سرکار
یہ لال، پردہ ہے، آپ کالے خاں نہیں مرزا کالے ہیں۔ اپنا اصلی نام
سن کر رنگ رو متغیر ہو جاتا ہے۔ پرانا ٹھاٹ[1] آنکھوں کے آگے پھر جاتا
ہے۔ طبیعت کو بمشکل سنبھالتا ہے۔ ارباب محفل وطن دریافت کرتے
ہیں، بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں

غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

ہم فقیروں کا کیا گھر کیا در جہاں درویش ہار گیا کہ شب آ ہر سرائے دست
اس بے سر و سامانی کو دیکھ کر لوگ استفسار حال کرتے ہیں۔ آنکھ اٹھا کر
ان کی جانب دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

چہ پرسی از سر و سامانِ من عمریست، چوں کاکل

سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بر دوشم

---

[1] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔

مہاراج میراثیوں میں نہیں مصاحبوں میں جگہ دیتے ہیں، اور مرزا کالے کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔ دست بستہ عرض کرتا ہے کہ مرزا کالے صاحب عالم دہلی غدر میں مارے گئے، اب تو یہ روسیاہ کالے خاں زندہ ہے۔ سرکار اگر آئندہ کالے خاں فرمائیں تو کرم ہوگا باقی زندگی اس گمنامی کے عالم میں گذار کر راہی ملک عدم ہوتا ہے یہ ہے ان کا مستقبل۔

منجم قدرت اتنا کہکر خموش ہوگیا اور محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھی ہچکیوں کی آواز آتی تھی گاہ گاہ کسی کونے سے آہ سرد اٹھتی تھی کہ اتنے میں طبلہ پر تھاپ پڑی اور بھاٹ نے آواز لگائی، مرزا فیروز شاہ تشریف لاتے ہیں۔ یہ طبلہ کے استاد بے بدل ہیں۔ جوڑی بجانے میں دور دوران کا جوڑ نہیں، اکثر نئے پرن[1] اور بولوں[2] کے موجد ہیں ان کے بول اب تک صرف دلی کے میراثی جانتے ہیں، باہر کے نہیں رنگیلے جوان ہیں۔ محفل رنگ و بو کے شوقین۔ مرزا فیروز شاہ بھی سم پورن[3] اترے اور دربار میں حسب مرتبت جگہ پائی۔ او ہو یہ

---

[1] طبلہ کی ایک اصطلاح ہے۔ [2] طبلہ کی ایک اصطلاح ہے۔ [3] موسیقی کی ایک اصطلاح ہے ۱۲

کندھوں پر بندوقیں رکھے ، گلے میں توبڑے لٹکائے کون چلے آتے ہیں ، سنئے بھاٹ کیا کہتا ہے ،

مرزا علی سلطان صید افگنی میں یکتائے روزگار ہیں ، ہرن کے منشا کو سمجھتے ہیں ، ان کا مارا پانی نہیں مانگتا ۔ مرزا ادریس جانور کا کھوج لگانے میں عدیم المثال ہیں ۔ مرزا قادر الدین قیامت کے قادر انداز جس پر ان کی نظر پڑ جائے کیا مجال جو بچ کر نکل جائے ۔ مرزا جہانگیر جس ہرن کو ایک مرتبہ جنگل میں دیکھ لیں مہینوں بعد پہچان جائیں ۔ مرزا غیاث الدین جناب کو دیکھ کر شکار الغیاث پکارتا ہے پر پناہ نہیں پاتا

ذرا سنو یہ چڑیوں کی آواز کہاں سے آنے لگی ۔ بھلا جس جگہ ایسے شکاری ہوں وہاں پرند کے پر جلتے ہیں ۔ پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے بندہ نواز ! یہ تو کوئی بزرگوار ستار بجا رہے ہیں ، واللہ عجب مضراب لگاتے ہیں ، بالکل چڑیاں چہکتی معلوم ہوتی ہیں ۔ بھاٹ نے آواز دی مرزا چڑیا تشریف لاتے ہیں ۔ یہ ستار نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے ، کھڑا ستار بجاتے ہیں ۔ مضرابیں کچھ ایسی ایجاد کی ہیں کہ ستار میں سے بالکل چڑیوں کی آواز نکلتی ہے ۔ اگر بیس پر وہ بجائیں تو

معلوم ہوتا ہے بہت سی چڑیاں چوں چوں کر رہی ہیں۔ ان کا ستار سن کر دلی ماتا نے آنکھ اُٹھائی اور قدرے مسکرائی۔ منجم ازل کی جانب نظر ڈالی اور ان کا مستقبل بیان کرنے کا حکم دیا۔

خادم حلقہ بگوش عرض پرداز ہوا کہ دنیا ان کی قدر کرے گی، پر یہ کہیں ٹکیں گے نہیں، ان کے پاؤں میں گردش پرکار ہے، لوگ ان کی خدمت کریں گے۔ مگر یہ دو چار دن سے زیادہ کہیں بسیرا نہ لیں گے آٹھ آنے سے دس روپیہ تک کی گت ان کے پاس تیار رہے گی، اس پر گذر اوقات ہو گی۔

یہ دو کج کلاہ کتابوں کے پشتارے بغلوں میں دبائے، کانوں میں قلم لگائے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کون چلے آرہے ہیں۔ بشرہ سے علم و ادب کے آثار نمودار ہیں۔ محفل میں جگہ کی گئی۔ بھاٹ نے مودبانہ آواز لگائی مرزا مجاہد الدین اور مرزا محمود شاہ تشریف لاتے ہیں۔ فارسی اور عربی پر کامل عبور رکھتے ہیں، اردو اور فارسی نظم و نثر میں ان کا جواب نہیں۔ منجم اشارہ پا کر کھڑا ہوا اور کہنے لگا، دولت علم سے مالا مال ہیں یہ کبھی تہی دست نہیں رہ سکتے۔ مرزا مجاہد الدین نثر میں جد و جہد

کریں گے اور یکتائے روزگار رہوں گے، حیدرآباد دکن میں نامہ نگاری پر قوت کی بنیاد ہوگی۔ دوسرے صاحب مسجد فتحپوری میں علم کا دریا بہائیں گے۔ اور دنیا کو فیض یاب کریں گے۔

اتنے میں مرزا قادر بخش تشریف لائے۔ بھاٹ نے عرض کی علی مد ہنوٹ اور پھری گتکہ کا استاد بے بدل ہے۔ اور یکتا کشتی گیر، ایشیا کی دس بارہ زبانوں پر قدرت رکھتا ہے، منجم قدرت اشارہ پاکر یوں عرض پرداز ہوا۔ دہلی کی تباہی کے بعد یہ لال قلعہ کا لعل دیار حبیب کی راہ لے گا۔ پر دلی کی یاد وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دے گی مٹی پھر کشاں کشاں دہلی لائے گی۔ برے حالوں بانکے دہاڑے تن پر چیتھڑے لگائے پیٹ پر پتھر باندھے، یہ شبنم اور آب رواں کا پہننے والا، نان دوں کا پالا اس اُجڑے دیار میں پھر آئے گا۔ یہاں کی دُنیا بدلی ہوئی، یہاں کا رنگ بگڑا ہوا پائے گا۔ مرزا ثریا جاہ خوف خدا کھا کر بطریق غربا پروری خان پور آگاہی پر لگا دیں گے، یہ بلبل ہزار داستاں دس بارہ زبانوں میں چہکنے والا گنواروں کے ساتھ سر پھوڑتا ہوا ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج، پیسہ پیسہ جمع کرتا راہی ملک عدم ہوگا۔ منجم اتنا کہہ کر

خموش ہوگیا۔ درباریوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہ رہے تھے۔ ولی ماتا کی ہچکی بندھی تھی۔ سر اٹھایا اور کہا یہ یادگار تیمور ہیں، یہ بابر کی اولاد ان کے ہاں بچہ ہاتھ میں تلوار لئے، سر پر تاج رکھے پیدا ہوتا تھا، آج ان کا یہ دھاڑا ہے۔

بہت آگ چلموں میں سلگانے والے بہت گھاس کی گٹھڑیاں[1] لانے والے
بہت دربدر مانگ کر کھانے والے بہت فاقہ کر کرکے مرجانے والے

جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں یہ جوہر
تو نکلیں گے نسل ملوک ان میں اکثر

انہیں کے بزرگ ایک دن حکمراں تھے انہیں کے پرستار پیر و جواں تھے
یہی مامن عاجز و ناتواں تھے یہی مرجع دیلم و اصفہاں تھے

یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی
انہی کے گھروں میں تھی صاحبقرانی

یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنئے افلاس میں مبتلا ہے جسے دیکھئے مفلس و بینوا ہے

[1] تغلق آباد کے گھسیاروں کی طرف اشارہ ہے۔

نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

باکمال اولاد سلاطین کا ابھی ایک جم غفیر کھڑا تھا، بھاٹ کچھ اور شہزادے پیش کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ حکم ہوا کہ ان کو حسب مرتبت جگہ دی جائے، اب ان کا حال تباہ سننے کی ہم میں تاب نہیں۔

یہ کون ماہ نیم ماہ نیر تاباں عَلَم علم اٹھائے چلا آرہا ہے، جس کے عقب میں بہت سے درخشندہ ستارے ہیں اور ان کے پیچھے نوجوانوں کا ایک ہجوم۔ اوہو یہ تو سر سید احمد خاں صاحب اپنے حوارین کو لئے آرہے ہیں۔ اور مسلمان طلبا کا ایک مجمع ترکش کوٹ اور سرخ ٹوپیاں پہنے ساتھ ہے۔ اس گروہ میں سے سر سید مع تین حواریوں کے آگے بڑھے۔ بھاٹ نے کہا سر سید احمد خاں صاحب بانی علی گڈھ کالج۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے امام تشریف لاتے ہیں، اور ان کے ساتھ منشی ذکاء اللہ، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی بھی ہیں۔ منشی ذکاء اللہ صاحب علم ریاضی کے استاد بے بدل، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولانا حالی کے نام پر محفل میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں بجنور اور

پانی پت کا نام لوگوں کی زبان پر آیا۔ بھاٹ دربار کی یہ فضا دیکھکر دم بخود رہ گیا۔ سر سیّد ان دونوں کا ہاتھ پکڑ آگے بڑھے اور کہا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے جنم بجنور میں بیشک لیا۔ لیکن علم اس سرزمین پر سیکھا تربیت یہاں پائی، عمر یہاں گذاری، یہاں کی مٹی تھی، انجام کار یہیں کی خاک میں جا ملی۔ ان کا دل، ان کی طبیعت، ان کی خوخصلت میرا وہ دلی کی تھی، مولانا حالی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ پر پلے دلّی میں۔ پروان یہاں چڑھے، دلی والوں سے زیادہ دلی کے دلدادہ ہیں اس شہر سے نسبت ازلی رکھتے ہیں جیسا کہ ان کے اشعار سے ٹپکتا ہے۔

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
جانا کہ نہیں اب کہیں دنیا میں ٹھکانا
حاؔلی بس اب یقین ہے دلّی کے ہو لئے
ہے ذرّہ ذرّہ مہر فزا اس دیار کا

سر سیّد کی سند پر ان دونوں بزرگوں کو دلی والا قرار دیا گیا اور دربار میں حسب مراتب جگہ پائی۔

ایسا کون آنے والا ہے کہ ارباب دربار مؤدب ہو بیٹھے۔

گوش بر آواز، نظریں منتظر قدم بوسی۔ بوئے گل پیک ہوا پر سوار ہوا خواہی کو تالب فرش حاضر۔ دو دعود سوز بلا گردانی کرتا چلا آرہا ہے بزم میں کون مسیحا دم آیا کہ نیم جانوں میں جان آئی، بے جان زندہ ہو گئے ہوا کا مزاج بدل گیا۔ محفل کی طبیعت رو بہ اصلاح ہوئی، افسردہ دروں شگفتہ دل ہو گئے۔ رنگِ رو تو دیکھو شاخ نبات میں گل شفتا لو کی جھلک دکھا رہا ہے۔ غلافی آنکھ و وائے دردِ دل، برگ گل سے ہونٹ تعویذ سکون قلب، کتابی چہرہ نسخۂ آب حیات، ورزشی بدن۔ اس پہ جامدانی کا انگرکھا، آدھا سینہ کھلا ہوا۔ کھڑکی دار پگڑی سر پر۔ خدمت پر آمادہ، افضل الاشغال خدمت الناس کا دلدادہ۔ یہ کون جوان بخت جوان ہمت ہے۔ بھاٹ کیا کہتا ہے۔

حکیم حاذق طبیب کامل حکیم محمود خاں صاحب تشریف لاتے ہیں اخلاق حمیدہ کی تصویر، شرافت و نجابت کا مجسمہ، حضرت خواجہ عبید اللہ احراری رحمۃ اللہ علیہ کی نسل میں سے حکیم محمد شریف خاں صاحب کی اولاد۔ دلی ماتا نے ان کی طرف محبت اور التفات سے دیکھا اور حکم دیا کہ کچھ اور حالات بیان کئے جائیں۔ بھاٹ نے دست بستہ

حکیم محمد خانصاحب

عرض کی کہ حکم کا بندہ، فرمان کا فرماں بردار، اگر اجازت ہو تو کچھ عرضِ بارگاہ خداوندی کرے۔ حکم ہوا کہو۔ باادب یوں عرض پرداز ہوا۔ خانہ زاد کے پاس الفاظ نہیں کہ ان کے صفات اور حالات کما حقہ بیان کر سکے اگر یہ کام مولانا حالی کے سپرد ہو تو مناسب۔ اشارہ پا کر مولانا حالی سروقد کھڑے ہو گئے اور یوں سخن سرا ہوئے۔

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب

خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

طب یونانی کا آخری ناخدا، اس ڈوبتے ہوئے بیڑہ کا کھیون ہار شرافت کا پتلا، نجابت کا مجسمہ، خوبیوں کی زندہ مثال۔ فخرِ شہر، فرخندہ خصال۔ جب دلی کا جہاز تباہی میں آیا ہوا تھا۔ جب سیلابِ بلا، گردابِ فنا کے تھپیڑے اس بیڑہ کے ٹکڑے اڑائے دیتے تھے۔ اس کا ایک ایک تختہ نذرِ امواجِ حوادث تھا۔ اور پھر ان تختوں کی چھپٹیاں تتر بتر ہوئی جاتی تھیں کسی کو کسی کا سہارا نہ تھا، ناخدا ہمت ہار چکے تھے، ملاحوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ یہ کوہِ راسخ مردِ میداں، جودی پہاڑ بھی تھا، نوح بھی کشتی بھی تھا ملاح بھی، بے ٹھکانوں کا ٹھکانا، بے سہاروں کا سہارا،

مصیبت زدوں کا ملجا۔ آفت رسیدوں کا ماوا ہے، مرتے ہوؤں کو آبِ بقا، بے گناہوں کا گواہ، برے وقت کا ساتھی، بُری بنی کا یار، دلی کی مٹتی ہوئی تہذیب کی امٹ یادگار، جب دلی میں غدر پڑ رہا تھا، اس شہر کو مصیبتوں نے گھیر رکھا تھا زمانہ دلی والوں کا دشمن تھا سر چھپانے کو بھی انہیں کہیں ٹھکانا نہ تھا، اس وقت اس شریف نے ان پر وہ احسانات کئے ہیں جن کے حق سے دلی والے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، آج سینکڑوں گھرانے اس کی بدولت پل رہے ہیں۔ ہزاروں اس کے طفیل میں عزت لئے بیٹھے ہیں، لاکھوں کی جائداد بچائی سینکڑوں کی جانیں، ہزاروں کی امانت گھر پر رکھی اور اس کی جان سے زیادہ حفاظت کی۔ وہ محمود خاں جو بغیر سواری کبھی باہر نہ نکلا تھا، جس نے عدالت کچہری میں کبھی قدم نہ رکھا تھا، بے گناہوں کے لئے وہ رات دن چکر میں تھا۔ پاؤں ایک اس کا عدالت میں تھا اور ایک گھر میں تھا

مولانا حالی اتنا کہہ کر بیٹھ گئے۔ دلی ماتا کا اشارہ پا کر نقیب نے حکیم صاحب موصوف کو صدر محفل جگہ دی۔

ٹھوڑی تارا، ماتھے چاند، سورج کی سی کرن، رنگ میدہ وشہاب

ستواسی ناک، غلافی آنکھ، چہرہ کی چھب دل میں کھبی جاتی ہے۔ ہر عضو بدن سانچہ میں ڈھلا ہوا، عجب سج دہج سے چلا آتا ہے۔ یہ کون جوان ہے کہ اہل دربار اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں جس کی جہاں نظر پڑی جم کر رہ گئی۔ ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ بے ساختہ زبان پر آیا۔ ؎

بسان شکل تو بت کمتر آفرید خدا

نزاکشیدہ دوست از قلم کشید خدا

یہ نیر تاباں شمس الدین خاں والئ فیروز پور دلوہارو ہے۔ بھاٹ نے اہل دربار سے تعارف کروایا اور کہا، آفتابِ حسن ہے اور تمام فنونِ سپہ گری کا مسلم الثبوت استاد۔ شاعر ہے اور بڑے پائے کا نقاد، اس کا دربار اہل کمال اور اہل علم کا ملجا و ماویٰ ہے۔ منجم تقدیر نے عرض کی، یہ ماہ رو پھانسی چڑھے گا، دلی ماتا نے آہ کی۔ منجم خموش ہوگیا۔ ارشاد عالی ہوا، واقعہ مفصل بیان کرو۔ عرض کی، داستان غم ہے، جوان کا ماتم ہے۔ افسانہ ناگفتہ بہ۔ فرمایا

امتیاز علم وجور وستم بھی نہ رہا کثرتِ غم سے اب اندازۂ غم بھی نہ رہا

کہو اور بے کم و کاست کہو،
منجم خوبی بیان زبان نوحہ خواں سے نواسنج ہوا کہ
زر و زن است و زمیں مایہ فساد و نزع
ترا بجان برادر کہ دل بہ ایں ننہی

اس بربادی میں بھی انہی کا دست تفرقہ انداز کام کر رہا ہے
نواب احمد بخش خاں صاحب والی فیروز پور دلوہارو کے دو محل ہیں
ایک کی اولاد میں یہ مہر نیم روز شمس الدین خاں ہیں۔ دوسری کے
بطن سے نواب امین الدین خاں صاحب اور نواب ضیاء الدین خاں
صاحب، بڑے لڑکے کو فیروز پور کہ حاصل ریاست ہے عطا ہوتا
ہے، اور آخر الذکر دونوں کو لوہارو، نواب احمد بخش خاں صاحب
خلد آشیانی ہوئے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ نواب امین الدین خاں صاحب کے مصاحبین
کج مشورت، مطلبی آشنا اور دلوں میں فرق ڈالنے والے
گھیرے بیٹھے ہیں، محبت و یگانگت کی بنیاد کھود ڈالتے ہیں
عناد و فساد کی طرح ڈال رہے ہیں۔ باپ کی ماتم پرسی کرتے جاتے

ہیں اور زہر اگلتے جاتے ہیں۔ سم قاتل گھول رہے ہیں۔ زہر اثر کر چلا۔ شیطان اپنا کام کر گیا۔ محبت کی عمارت ڈگمگانے لگی۔ دشمنی کی سرنگ میں شتابہ لگا، نواب امین الدین خاں صاحب نے منشی کو طلب کیا دوات قلب سیاہ لے کر آئی۔ صفحہ قرطاس نقش محبت سے پاک قلم دہن دریدہ روئے سیاہ لئے حاضر ہوئی۔ صفحہ ہستی سے حرف محبت مٹ رہا ہے۔ سرکار انگریزی میں درخواست گذاری کہ والد مرحوم کی وصیت متروکہ غیر منقولہ کی بابت ہے۔ ترکہ منقولہ ہم میں تقسیم کر دیا جائے۔ بنائے مخاصمت پڑ گئی دو رئیسوں میں بگڑ گئی۔ فیصلہ امین الدین خاں صاحب کے موافق ہوتا ہے شمس الدین خاں صاحب آگرہ میں اپیل کرتے ہیں، ولایت کے قانون کے مطابق لوہارو بھی بڑے لڑکے نواب شمس الدین خاں صاحب کو مل جاتا ہے امین الدین خاں صاحب اور ضیاء الدین خان صاحب کے حق میں ایک ایک ہزار روپیہ گذارہ کا حکم ہوتا ہے،

نواب امین الدین خاں صاحب کے پاس یہ کون انگریز بیٹھا ہے ادہو۔ فریزر صاحب ہیں۔ چپکے چپکے باتیں ہو رہی ہیں۔ نواب صاحب

افسردہ خاطر سے بیٹھے ہیں۔ فریزر کہتا ہے، بھائی امین الدین پریشان نہ ہو۔ اس وقت موقع اچھا ہے۔ کلکتہ کا گورنر میرا دوست ہے۔ تم وہاں اپیل کرو۔ میں سفارشی چٹھی دیتا ہوں کام بن جائے گا۔ پردہ کے پاس یہ کون کھڑا کن سوئیاں لے رہا ہے۔ غضب ہو گیا۔ یہ تو خنجر بیگ شمس الدین خاں صاحب کا آدمی ہے۔ بھائی کے ہاں لوٹہ لینے کو چھوڑ رکھا ہے۔ پتنگ چھڑی۔ پل کی پل میں نواب شمس الدین خاں صاحب کے ہاں جا پہنچا۔ سارا معاملہ کہہ سنایا۔ نواب صاحب کی خاطر عاطر مکدر ہو گئی۔ ٹہل رہے ہیں۔ چہرہ غصہ سے تمتما رہا ہے۔ فسادی عنادی یہاں بھی موجود ہیں۔ ایک نے کہا۔ اس فریزر نے بڑا غضب ڈھا رکھا ہے۔ جب تک یہ ہے جمع خاطر معلوم۔ دوسرا بولا قضا سر پر کھیل رہی ہے۔ تیسرے نے کہا، بہنگا ہے، منٹوں میں چٹ پٹ کیا جا سکتا ہے۔ نواب صاحب نے موچھوں پر ہاتھ پھیرا اور کریم خاں کو طلب کیا۔ سیاہ فام گرانڈیل جوان ہے، آنکھوں سے قہاری ٹپک رہی ہے۔ چپکے چپکے اس کو کچھ ہدایتیں کیں اور کہا، انیا اور واصل کو سانڈنیوں پر ساتھ لے جا۔ وہ آداب کر چلتا ہوا۔ نواب صاحب ایک

غوط میں خموش بیٹھے ہیں۔

اندھیری رات ہے اور چاروں طرف سناٹا۔ ایک شخص گھوڑے پر سوار اور دو سانڈھنی سوار دلی کے قریب باڑے پر درختوں کی آڑ میں کھڑے ہیں۔ ایک بجے کا عمل ہے۔ ایک انگریز تن تنہا گھوڑے پر سوار اس طرف چلا جا رہا ہے۔ سانڈھنی سواروں نے راستہ روکا، گھوڑے پر جو شخص ہے اس کے ایک ہاتھ تلوار کا دیا۔ انگریز طپنچہ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتا تھا کہ ایک تلا ہوا ہاتھ اور مارا۔ کام تمام کر دیا۔ پچھاڑ کھا کر گرا، خون کے شرائے بہ گئے۔ تمام زمین لہو لہان ہو گئی۔ انگریز مارا گیا ہے۔ یہ خون رنگ لائے گا ع

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔ قاتلوں نے اپنا اطمینان کیا کہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ یا ابھی کچھ جان باقی ہے۔ سانڈھنی سواروں نے اپنی راہ لی، اصل قاتل نے دلی کا رخ کیا۔ شہر کے دروازے بند ہیں۔ یہ تمام رات باہر پھرتا رہا صبح دلی دروازہ سے داخل ہو دریا گنج میں نواب صاحب فیروزپور کی کوٹھی میں آیا۔ وہ یہ تو کریم خاں ہے جس کو کچھ روز پہلے ہم نے نواب شمس الدین خاں صاحب کے پاس دیکھا

تھا۔ گھوڑا اصطبل میں باندھ چارپائی پر سستانے کو لیٹ گیا۔

یہ کس کی نعش ہے جسے تمام افسران گھیرے کھڑے ہیں، آپس میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ ایک بولا فریزر صاحب رات کو مارے گئے۔ دوسرے نے کہا مہاراجہ صاحب بلبھ گڑھ کے ہاں سے دعوت کھا کر جا رہے تھے۔ تیسرا بولا نعش باوسٹے پڑی تھی قاتل مفرور ہے۔ لورنس صاحب مجسٹریٹ قریب کھڑے زخموں کو دیکھ رہے ہیں کہ نواب فتح الدین بیگ تشریف لائے، یہ نواب امین الدین خاں صاحب کے قریبی رشتہ دار ہیں نعش دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے، کہنے لگے بھائی فریزر میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ فیروز پور سے کریم خاں تجھے مارنے کو آیا ہوا ہے۔ تو اکیلا دکیلا نہ پھر۔ تو نے میری بات نہ مانی اور اپنی جان دی یہ بات لارنس صاحب نے سنی اور مجمع میں سے باہر آ گئے۔ سیدھے نواب صاحب فیروز پور کی کوٹھی پہنچے، تقضاء عند اللہ، دروازہ پر کریم خاں کھڑا ہے، پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا سپاہی۔ کیا نام؟ جواب ملا کریم خاں۔ دریافت کیا کہ دہلی کب آیا؟ اس نے جواب دیا کوئی دس روز ہوئے، کیوں آیا تھا؟ سرکاری کام کو۔ اصطبل دریافت

کیا۔ اس نے اشارہ سے بتایا۔ وہاں دیکھا تو ایک گھوڑا پسینہ میں شرابور کھڑا تھا، کریم خاں سے دریافت کیا تیرا گھوڑا کونسا ہے اس نے اسی کی طرف اشارہ کیا۔ کریم خاں گرفتار ہوا۔

وہ سانڈنی سوار مارا مار منزلیں مارتے فیروزپور کی طرف چلے جا رہے ہیں، سانڈھنیاں پسینہ پسینہ ہو رہی ہیں، پر یہ دبائے لئے چلے جاتے ہیں، صبح ہوتے فیروزپور آ لیا۔

محل کے دروازہ پر پہنچے، اطلاع کروائی کہ واصل حاضر ہے فوراً طلبی ہوئی، نواب شمس الدین خاں صاحب مع مصاحبوں کے بیٹھے تھے، یہ آداب بجالایا اور کہا، حضور مبارک ہو۔ انہوں نے کہا مار دیا؟ جواب دیا آپ کے اقبال سے، ارشاد ہوا شاباش اچھا آرام کر۔ واصل باہر نکلا ہی تھا کہ ایک مصاحب نے کہا، اس کو مروا دیجئے مبادا قبول دے، نواب صاحب نے قدرے توقف کیا۔ پھر آواز دی، واصل کو بھیجو، وہ یہ باتیں سن چکا تھا، باہر ہی سے جواب دیا، ابھی حاضر ہوا ذرا اونٹنی باندھ آؤں۔ بس اتنا کہتے ہی اونٹنی کی پیٹھ پر بیٹھا، بتحارہ کے علاقہ میں جا کر رپورٹ درج کرائی۔

یوسف زنداں میں ہے شمس الدین خاں کشمیری دروازہ کے باہر قید آج سنگار کیوں ہو رہا ہے! کیا رہائی کا حکم آگیا۔ نہیں آج قیدِ ہستی سے رہائی ہے۔ نہا دھو پوشاک پہن عطر مل باہر نکلا، بسم اللہ کہہ کر پھانسی کے تختہ پر قدم رکھا۔ بھنگی جو کھڑا تھا اس کو ہٹا دیا۔ اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈال جاں بحق تسلیم ہوا۔

اہل دربار زار زار رو رہے تھے۔ ولی نے اس نوجوان جانہار کو حسرت دیاس سے دیکھا اور سر پکڑ کر ہو بیٹھی۔ نقیب نے صدر محفل لے جا بٹھایا۔

یہ کون جوان گھٹنا پہنے انگرکھا زیب تن کئے ہاتھ میں بانس کی کھپچیاں لئے چلا آرہا ہے۔ قادر البیانی، بسیار نویسی بلکہ انبار نویسی کتابوں کا پشتارہ لئے جلو میں حاضر۔ بھاٹ نے آواز دی۔ خواجہ امان مترجم بوستان خیال تشریف لاتے ہیں۔

طبیعت اس قدر مصروفیت پسند ہے کہ ہمہ وقت کھپچیاں ہاتھ میں اور قلم تراش جیب میں رہتا ہے۔ جہاں خالی وقت ملا کھپچیاں تراشیں، کھاڑے اور کاپنیں بنانی شروع کر دیں۔ حسبِ مرتبت جگہ

پائی۔ یہ تھوڑی دیر تو کچھ بے چین سے بیٹھے رہے۔ خالی بیٹھنا ان کی طبیعت کے خلاف اور آداب دربار مانع۔ آخر کار جب نہ رہ سکے زمین خدمت کو بوسہ دیا اور اجازت چاہی، ان کے جانے پر دربار میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ اور بزم خموشاں کی آواز ولی ماتا تک پہنچی۔ ماتا جی نے استفسار فرمایا۔ معلوم ہوا کہ آخر شب خواجہ صاحب کے ہاں محفل آراستہ ہوتی ہے اور اہل شہر اس کو بزمِ خموشاں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ولی ماتا بھی بیٹھے بیٹھے اکتا گئیں تھیں، فرمایا آؤ ہم بھی دیکھیں شہر میں کیا ہو رہا ہے، دربار برخاست ہوا جوگن جی چیلیوں کو ساتھ لے چل کھڑی ہوئیں۔ تاجدار مشرق افقِ مغرب میں غروب ہوتا ہے جوگن جی جامع مسجد پہنچتی ہیں۔

پانچ ہزار بندگان خدا نے چھ سال کام کیا دس لاکھ روپیہ خرچ ہوا ۱۶۵۰ء میں زیر اہتمام سعداللہ خاں دیوان اعلیٰ اور فاضل خاں خان ساماں ۱۰ شوال کو بن کر تیار ہوئی۔ شاہجہاں کا نقشہ تھا مسجد جہاں نما نام پایا۔ موضع جہاں نما جو اب صدر بازار کہلاتا ہے

مصارف مسجد کے واسطے وقف ہوا۔ صحیح النسل سید امامت کو بلائے گئے۔ آل رسول ہی کو یہ شرف ہو سکتا ہے کہ بادشاہ وقت کی جانب پشت کرے کسی اور کو یہ امتیاز نہیں بخشا جا سکتا دور شاہجہانی نہ رہا۔ اورنگ زیب زیب اورنگ ہوا، نیرنگ روزگار کا آشنا کج خرامی فلک کینہ پرور کا واقف سر تاجدار جانتا تھا کہ دور مغلیہ ایک نہ ایک دن دور فلک کی نذر ہو جائے گا۔ اس وقت کون برسر اقتدار ہو، اس کا کیا مذہب ہو اور کیا خیالات، موضع جہاں نما مسجد کے قبضہ میں رہے نہ رہے۔ پھر چراغ بتی کی بھی مشکل ہو گی اور خانہ خدا میں اندھیرا پڑا رہے گا۔ دور اندیش نے دور کی سوچی اور مسجد کے گرد تھوڑی تھوڑی زمین چاروں طرف وقف کر دی۔ اس وقت یہاں بازار لگا ہوا ہے جس کو چوک کہتے ہیں۔ عجب چہل پہل ہے چھیل چھبیلے، جوان سجیلے پہلوان، تیکھے بانکے، مصروف سیر ہیں، بدن بنے ہوئے، ڈاڑھیاں چڑہی ہوئیں، مونچھیں نیش عقرب، تیکھی چتون، کسرتی بدن، بھیڑ بھاڑ کا یہ حال کہ راستہ چلنے کو رستہ نہیں امیر امرا سواریوں میں، غریب غربا پاپیادہ، انگرکھے بدن پر کسی نے

نیچے کرتہ پہن رکھا ہے، کسی نے نہیں، پائنچوں کی ایک ایک آستین غائب، آڑی ٹوپیاں لگائے چلے جا رہے ہیں۔

ایک طرف نیم حکیم خطرۂ جان اپنی دکان سجائے عجب سج دھج سے بقراط وقت بنے بیٹھے ہیں۔ سامنے دس بیس دواؤں کی تھیلیاں کھلی دھری ہیں اور خود کل امراض کے علاج پر کمربستہ۔ خدا شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر کسی نہ کسی بہانہ دے ہی دیتا ہے، کوئی نہ کوئی اُلّو پھنستا ہے اور ان کا اُلو سیدھا ہوتا ہے حکیم صاحب دو چار روپیہ بنا لیتے ہیں، آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا آیا اور انہوں نے چرب زبانی سے کام لیا روغن قاز ملا کچھ علاج الامراض پر تبصرہ فرمایا۔ امراض الابدان کی تشریح کی، گاہک پھنسا یا کام بنایا اور سیدھے ہو لئے۔ سچ ہے خدا بھوکا اٹھاتا ہے، بھوکا سلاتا نہیں

ع۔ بھرتا ہے رزق سے رزاق دہن پتھر کے۔

وہ سامنے کوابی چولھا سلگائے کواب لگائے بیٹھا ہے پیاز کے لچھے کترے رکھے ہیں۔ چٹ پٹی چٹنیاں سلیقہ سے چنی ہوئی ہیں انہوں کی رغبت آتی ہے۔ گاہک ہے کہ ٹوٹا پڑتا ہے، دکان دار

کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔ پانچوں گھی میں ہیں، کوئی دو کے
مانگ رہا ہے کوئی چار کے۔ دو چار کھڑے مشورہ کر رہے ہیں کو لنے
کھائیں کو نسے نہیں۔ اغل بغل شاگرد بیٹھے آواز لگا رہے ہیں سننے
والوں کے منہ میں پانی بھرا چلا آتا ہے۔ الواع واقسام کے کواب
موجود ہیں۔ قی تے کے کواب بھی ہیں۔ گولہ کے بھی۔ لونگ چڑے ہیں، چڑیا
کے بھی۔ پانی کی پھلکیاں سیخ کے کواب۔ پھلکیاں۔ شامی کواب۔ یہ
میاں جانی کوابی ہیں، اس وقت ہندوستان بھر میں ان کا جواب
نہیں۔ مصالحہ کا اندازہ کچھ ایسا صحیح ہے کہ ہر شخص کو مزا دے جاتے
ہیں۔ ایک دفعہ منہ کو لگے پھر چھٹتے نہیں۔ جو کھاتا ہے انگلیاں چاٹتا ہوا
جاتا ہے۔ لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اور روپوں بندوں کے
کھاتے ہیں۔ ان کی دکان پر سر شام سے گھما گھمی رہتی ہے اور دکنداری کا
بازار گرم۔ دس بیس کے پیچ کر اٹھتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو جائدادیں
کھڑی کر لیتا۔ پر یہاں وہی ڈھاک کے تین پات ہیں۔ جیسے چٹخارہ دار
کواب بناتے ہیں ویسے ہی خود بھی چٹکیلے ہیں، ان کا قول ہے۔

چٹ ڈال مال دہن کو۔ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔ جس نے دیا ہے

تن کو۔ دے گا وہ ہی کفن کو۔ گر یار ہے تو عاشق۔

ایک جانب جانوروں کا بازار لگا ہوا ہے، کچھ کابکوں میں بند ہیں کچھ پنجروں میں۔ بعض جال میں پھنسے ہیں۔ بعض رشتہ بر پا چندن چکور شیرازی کے جوڑے، بلبل ہزار داستان۔ طوطیٔ خوش الحان چنڈول، اگن، بنگالہ کی مینا، کاکتوا، باز، شہباز، جرعہ، اصیل، مرغ، تیتر، بٹیر، غرضکہ دنیا بھر کا جانور یہاں موجود ہے۔ چڑی مار۔ شکاری پھانس کرلاتے ہیں۔ بڑے بڑے استاد جانوروں کو بولیاں سکھاتے ہیں، اُن کو سدھاتے ہیں۔ شوقین شام کے وقت چوک پر آتے ہیں۔ دکاندار منھ مانگے دام پاتے ہیں۔ استاد میرن بھی پھر رہے ہیں، شاہی بلبل ہزار داستان ان کا ہی پڑھایا ہوا ہے جہاں کوئی اچھا جانور نظر پڑا اور یہ ٹھٹکے۔ جدھر ان کی نظر پڑی اُدھر ہی گاہک ٹوٹ کر گرا۔ مشت پر شوقین کی نظر چڑھا۔ اور دام چڑھے دیکھئے وہ چار چھیل چھبیلے آپس میں چُہل کرتے چلے جارہے ہیں۔ ذرا سنیں ان میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

مرزا۔ جناب گنجفہ کے میر صاحب اب کیا خیال ہے۔

میر۔ جناب مرزئی صاحب۔ خیال من ہمہ آن است کاں خیال شماست۔

خان۔ واہ میر کیا کہنے! یہ مرزئی کی ایک ہی رہی۔ ہم کو ڈر ہے کہیں کوئی شوقین ان کو مرزئی سمجھ کر زیب بر نہ کرلے۔

مرزا۔ اچھا خاں صاحب بھی چڑکے۔ خیر سے ابھی سن و سال ہی کیا ہے۔ جو ہر کی پڑ گئی۔ بہرکیف رجحان طبع معلوم ہو گیا۔ انشاء اللہ جلد کوئی شکل نکالی جائے گی۔

شیخ ۔ معاف کیجیے گا جناب کی گفت گو، کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آئی

مرزا۔ بندہ نواز یہ دلی والوں کی باتیں کچھ دلی والے ہی بہتر سمجھتے ہیں جناب ان کو سمجھنے کی کوشش نہ فرمائیں تو بہتر۔ اب یہ بتایئے کہ ارادہ کیا ہے۔

شیخ صاحب ہمارا کیا ارادہ۔ یہاں تو سپردم بتو کا معاملہ ہے۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مرزا۔ بھئی میرا بہ ہنسی مذاق تو جانے دو، ہماری مانو تو کہیں چل کر

گانا سنو۔

میر۔ ہماری صاد ہے۔

خان۔ اور ہماری بھی۔

شیخ۔ کس کا گانا سنئے گا صاحب

خان۔ بندہ نواز کسی طوائف کا سنیں گے۔

شیخ۔ کیا دلی والے طوائفوں کا گانا سنتے ہیں۔

میر۔ بیشک۔ کیا جناب کے شہر کے شرفا داعظ کا وعظ سن سن کر زندگی کے دن گذارتے ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ اعتراض مدنظر نہیں ہے۔ ہر شہر کے دھرسے، اپنا اپنا شوق ہے۔ ہم ارباب نشاط سے دل بہلاتے ہیں، آپ واعظ وزاہد سے۔

تجھ کو مسجد ہے مجھ کو مے خانہ
زاہدا اپنی اپنی قسمت ہے

شیخ۔ یہ گناہ بھی تو ہے۔

میر۔ بندہ پرور کیا گناہ ہے اور کیا ثواب یہ ایک طویل بحث ہے ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ جہنم کی رنڈیوں اور پیدائشی یتیموں کی خدمت

اگر ثواب نہیں تو گناہ بھی نہیں ہو سکتی

شیخ۔ کیا درحقیقت آپ ایسا سمجھتے ہیں۔

میر۔ صاحب یہ عالم مجاز ہے۔ یہاں حقیقت کا کیا کام۔ یہ سب باتیں برسبیل گفتگو ہیں ورنہ اصل معاملہ تو یہ ہے کہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

خان۔ آیئے آج تو اس کوٹھے پر چلیں دیکھیں کیا رنگ ہے۔

چاروں یار زینہ پر چڑھنے شروع ہوئے۔ شیخ صاحب سب کے پیچھے کنی بچائے چلے آرہے ہیں۔ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ مرزا صاحب، خاں صاحب اور میر صاحب تو درّانہ اندر چلے گئے، یہ بیچارے ذرا چوکھٹ پر ٹھٹکے خان صاحب نے ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹا اور کہا بھئی عجب تماش کے آدمی ہو، یہاں کوئی ہوّا بیٹھا ہے جو تم کو کھا جائے گا۔ ڈرتے کیوں ہو۔ لو دیکھو۔ یہ پری چہرہ برق دم تمہارے استقبال کو سرو قد کھڑی ہیں۔

طوائف کاسنی رنگ کی، زربفت کا آڑا پاجامہ پہنے ہم رنگ

کرتہ دوپٹہ پہنے اوڑھے ٹانگ پر ٹانگ رکھے نہایت ٹھسے سے بیٹھی تھی، ان کو دیکھکر کھڑی ہوئی اور ایک ادائے خاص سے آداب بجالائی، یہ سب گاؤتکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب خاں صاحب اور میر صاحب تو کہنہ مشق تھے، آرام سے جا بیٹھے ہمارے شیخ جی کچھ پیچھے پیچھے سے ان تینوں کی اعراب میں بیٹھے ہیں طوائف نے چاندی کی تھالی میں پان پیش کئے، میر صاحب نے نام دریافت کیا۔

طوائف۔ اس ناچیز کو مشتری کہتے ہیں۔

میر۔ اوہو آپ ہی وہ مشتری ہیں جن کی مانگ کہکشاں اور بال سنبلہ ہیں۔

مشتری۔ سرکار تو آسمان کے تارے توڑتے ہیں۔ فلک الافلاک کی خبر لاتے ہیں۔

مرزا۔ مشتری جان! ہمارے میر صاحب فلک[1] سیر کا شوق فرماتے ہیں

مشتری۔ ماشاءاللہ! جبھی تو دماغ آسمان پر رہتا ہے۔

---

[1] ایک معجون کا نام ہے۔

مرزا۔ اور زہرا جبینوں کے دلدادہ ہیں۔

مشتری۔ حضور یہ زہرہ کی چاہ اچھی نہیں، کہیں چہ بابل نہ جھانکنی پڑے

میر۔ زہے نصیب۔ اس دن کا تو انتظار ہے۔

مشتری۔ آخر یہ کیوں۔

میر۔ بات یہ ہے کہ ہماری قسمت روزِ ازل سے اُلٹی ہے۔ جب ہاروت ماروت کی طرح ہم اُلٹے لٹکائے جائیں گے۔ تو قسمت سیدھی ہو جائے گی،

مشتری واہ حضور کیا کہنے۔ خدا کی قسم کیا بات پیدا کی ہے جناب ولی والے ہیں۔

میر۔ بیشک۔

مشتری جبھی تو۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر جوگن جی بھی حضرت سرمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے آستانۂ مبارک پر حاضری دیتی ہوئی پائے والوں کی طرف سے خراماں خراماں اسی کوٹھے کے نیچے آن پہنچیں۔ اور ذرا ٹھٹکیں۔ مصاحبین ادا شناس تاڑ گئے۔ کہ طبیعت سیرِ عالم

رنگ و بو کی طرف مائل ہے۔ سب کے سب جلو میں دست بستہ دم بخود کھڑے ہیں، دلی ماتا اس سکوت کے معنی سمجھ گئیں، خادمان حلقہ بگوش کی جانب دیکھا اور فرمایا جب جوگیا بھبوت لیا تو پھر جہاں جی چاہا بیٹھ گئے، کچھ امتیازِ جاہ و جلال باقی نہیں رہتا۔ آؤ ذرا گانا سنیں آگے آگے جوگن جی، پیچھے پیچھے چیلے، بی مشتری کے کوٹھے پر جا پہنچے، یہاں برآمدہ میں استاد ساز ملا رہے ہیں۔ ایک کونے میں بی نائکہ جان بیٹھی پان لگا رہی ہیں۔ ہمارے رنگیلے دوست بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ جوگن جی اور ان کے ساتھیوں کو آتا دیکھ کر سب قرینہ قرینہ سے ہو گئے۔ بی مشتری نے مجرئی عرض کیا۔ اور پھر سکڑ سکڑا کر ہو بیٹھیں۔ تمام ارباب محفل کو پان پیش کیے گئے۔ اتنے میں ککڑ والا حقہ لے آیا۔ دو دو دم سب نے لگائے دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ خمیرہ کی خوشبو سے سارا کوٹھا مہک اٹھا۔ اپنی قسمت کا لیے دعائیں دیتا چلا گیا۔ اتنے میں استاد اپنا ساز و سامان لے کر آن پہنچے پہلے سب کو جھک جھک کر آداب بجا لائے۔ پھر بیٹھ گئے۔ بائی جی ان کے آگے بدن کو دوپٹہ میں چھپائے۔ آنچل پیروں میں دبائے

تشریف فرما ہوئیں۔ پہلے خیال ٹپہ شروع ہوا۔ پھر غزل اور ٹھمری
کی نوبت آئی۔ رنڈی کا کوٹھا کبوتر باز کی چھتری ہے۔ بھانت بھانت کا
آدمی آتا ہے۔ ابھی گانے بجانے کا سلسلہ جاری تھا کہ تین چار اور آن دھمکے
ان میں آگے ایک صاحب ہیں۔ پستہ قامت سانولا رنگ، شوخ چشم
ان کو دیکھکر مشتری نے تبسم زیر لب کیا۔ اور استاد کہہ کر مجرا
بجالائی، انہوں نے بھی ایک انداز خاص سے اس کی جانب دیکھا
اور مسکرا کر ہو بیٹھے، دو چار چیزیں سنیں۔ مشتری سے آنکھوں ہی
آنکھوں میں کچھ چہ می گوئیاں ہوئیں اور یہ چلتے ہوئے مشتری نے کہا
بھی، استاد کچھ دیر تو تشریف رکھئے، ایسی بھی کیا جلدی ہے، یہ
بولے بی صاحبہ بات یہ ہے کہ ہماری زبان میں ہو رہی ہے چل۔
اور یہ للّو سٹلو ماننے کی نہیں۔ بس ہمیں جانے ہی دو، طوائف نے
اٹھ کر آداب عرض کیا اور کہا کل آئے گا۔ یہ بولے، کیوں نہیں
تم ہم کو تو گردان سمجھو۔ پر یہ بتاؤ۔ تم آج شربت کاسنی کیوں بنی بیٹھی ہو
مشتری۔ میں ہوں بھی تو دوائے دردِ جگر
اُستاد۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ کوئی جانہار گھول کر نہ پی جائے۔

مشتری۔ اوہو بڑے گھوں کر پینے والے۔

استاد۔ تم جانو۔

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار

اب مان نہ مان تو ہے مختار

استاد تو یہ کہہ کر چلدیے، ولی ماتا نے ان کی بابت دریافت کیا کہ یہ کون تھے۔ ہمراہیوں میں سے ایک نے عرض کی، سرکار یہ اُستاد محمد بیگ ہیں۔ بے پناہ بن اوٹ جانتے ہیں، نہایت چابک دست چابک سوار ہیں۔ ضلع۔ جگت پھبتی اور حاضر جوابی میں ان کا جواب نہیں۔ ہولی دیوالی کی کھچڑیوں میں ان کا ڈنکا بجتا ہے پھکڑباز ان کو استاد مانتے ہیں۔ وینا بیگ خاں کے کٹرہ پر ان کا کمرہ ہے۔ وہاں روز محفل آراستہ ہوتی ہے۔ شہر بھر کا تیز طرار شوخ گفتار جمع ہوتا ہے، اکثر زبان دراز دور دور سے مقابلہ کے لئے آتے ہیں، استاد کی سب سے چھوٹ ہوتی ہے۔ جو منھ آتا ہے۔ منہ کی کھاتا ہے۔ ظالم ایک نہ ایک ایسا فقرہ چست کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منھ زور منھ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جواب بن نہیں پڑتا۔ اپنا سا منھ لیکر چلا

تشریف فرما ہوئیں۔ پہلے خیال ٹپہ شروع ہوا۔ پھر غزل اور ٹھمری
کی نوبت آئی۔ رنڈی کا کوٹھا کبوتر باز کی چھتری ہے۔ بھانت بھانت کا
آدمی آتا ہے۔ ابھی گانے بجانے کا سلسلہ جاری تھا کہ تین چار اور آن دھمکے
ان میں آگے ایک صاحب ہیں۔ پستہ قامت سانولا رنگ، شوخ چشم
ان کو دیکھکر مشتری نے تبسم زیر لب کیا۔ اور استاد کہہ کر مجرا
بجا لائی، انہوں نے بھی ایک انداز خاص سے اس کی جانب دیکھا
اور مسکرا کر ہو بیٹھے، دو چار چیزیں سنیں۔ مشتری سے آنکھوں ہی
آنکھوں میں کچھ چہ می گوئیاں ہوئیں اور یہ چلتے ہوئے مشتری نے کہا
بھی، استاد کچھ دیر تو تشریف رکھئے، ایسی بھی کیا جلدی ہے، یہ
بولے بی صاحبہ بات یہ ہے کہ ہماری زبان میں ہو رہی ہے چل۔
اور یہ للّو ستلو ماننے کی نہیں۔ بس ہمیں جانے ہی دو، طوائف نے
اٹھ کر آداب عرض کیا اور کہا کل آئے گا۔ یہ بولے، کیوں نہیں
تم ہم کو تو گردان سمجھو پر یہ بتاؤ۔ تم آج شربت کا سنی کیوں بنی بیٹھی ہو
مشتری۔ میں ہوں بھی تو دو لائے دردِ جگر
اُستاد۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ کوئی جا نہار گھول کر نہ پی جائے۔

مشتری۔ اونھ بڑے گھوں کر پینے والے۔

استاد۔ تم جانو۔

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار

اب مان نہ مان تو ہے مختار

استاد تو یہ کہہ کر چلدیئے، ولی ماتانے ان کی بابت دریافت کیا کہ یہ کون تھے۔ ہمراہیوں میں سے ایک نے عرض کی، سرکار یہ استاد محمد بیگ ہیں۔ بے پناہ بن اوٹ جانتے ہیں، نہایت چابک دست چابک سوار ہیں۔ ضلع۔ جگت پھبتی اور حاضر جوابی میں ان کا جواب نہیں۔ ہولی دیوالی کی کفر کچہریوں میں ان کا ڈنکا بجتا ہے پھکڑباز ان کو استاد مانتے ہیں۔ وینا بیگ خاں کے کٹرہ پر ان کا کمرہ ہے۔ وہاں روز محفل آراستہ ہوتی ہے۔ شہر بھر کا تیز طرار شوخ گفتار جمع ہوتا ہے، اکثر زبان دراز دور دور سے مقابلہ کے لئے آتے ہیں، استاد کی سب سے چھوٹ ہوتی ہے۔ جو منھ آتا ہے۔ منہ کی کھاتا ہے۔ ظالم ایک نہ ایک ایسا فقرہ چست کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منھ زور منھ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جواب بن نہیں پڑتا۔ اپنا سا منھ لیکر چلا

جاتا ہے، استاد چلتے چلتے فقرہ کستا ہے، دیکھنا جیسے پیٹھ دکھائی ویسے منہ بھی دکھانا۔ پھر بھی آنا۔ جو ایک دفعہ مقابلہ پر آجاتا ہے۔ اس کا پھر منہ نہیں پڑتا کہ منہ دکھائے، استاد ایسا منہ توڑ دندان شکن فقرہ کہتا ہے کہ منہ پھیر دیتا ہے۔

والیٔ بھوپال سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے جب بھوپال کو آراستہ کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے وزیر جمال الدین اسم بامسمی نے ہر گلشن سے پودا لا کر لگایا۔ دلی کی پود اس وقت ٹکے دھڑی بک رہی تھی یہاں سے استاد محمد بیگ کو لے گئے، انہوں نے جانے سے پہلے قول لے لیا کہ میرے قول اور فعل پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہوگی۔ کچھ عرصہ وہاں رہے پر طبیعت کا غنچہ کملانے لگا۔ ہم صفیران چمن کی یاد ستانے لگی اس باغ کے بلبل وضع دار بھی ہیں وفادار بھی۔ یہاں کی بہار لٹ چکی تھی، باغ اُجڑ چکا تھا پر کیا کرتے، ان کو اس مٹی سے محبت تھی۔ نوکری چھوڑ چلے آئے، اب بھی ان کے قدردان موجود ہیں۔ برُے بھلے حالوں گذر ہو ہی جاتی ہے۔

اس وقت بھی ان کے کمرہ پر شہر بھر کا پھکڑ جمع ہوگا اور فقرہ بازی

کی محفل آراستہ۔ یہ سن کر ولی ماتا نے کہا آؤ ہم بھی استاد کے کمرہ پر چلیں۔ ساتھی ہکا بکا رہ گئے۔ اب بغلیں جھانک رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتا ہے اور دم بخود ہے۔ ولی ماتا یہ کیفیت دیکھکر بولیں، آپ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ یا سکتہ ہو گیا یہ ایک دم سکوت کیوں۔ سب چپ ہیں، بولے تو کون بولے ایک درباری نے زمین خدمت کو بوسہ دیا، کمر اطاعت پر دست التجا رکھے اور عرض کی، گوش گذار بارگاہِ خداوندی کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مقام قابلِ قدومِ میمنت لزوم نہیں۔ یہ سُن کر ولی ماتا مکدر ہو گئیں اور چہرہ پر غم وغصہ کے آثار نمودار۔ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور فرمایا، نیند کے ماتو۔ مصیبتوں اور ذلتوں کا آفتاب سر پر آن پہنچا اور ابھی تک تم عیش وعشرت کی نیند سو رہے ہو۔ عزت وجلال کے خوشگوار خواب دیکھ رہے ہو۔ یہ آنکھیں جو ایک نگاہ میں دنیا کو نہال کر دیتی تھیں، نونہالوں کو رو چکیں، یہ ہاتھ جو دھن برساتے تھے، اپنوں کو ڈھوتے ڈھوتے شل ہو گئے سرجوڑا تونے یارا اور گل تکیوں پر رہتا تھا، بارِ دوش کا نٹا سا کھٹکتا

ہے۔ یہ سینہ جو خوشی و خرمی کا خزینہ تھا آج حسرت و حرمان کا دفینہ ہے اور تم ہو کہ وہی داستان پارینہ لئے بیٹھے ہو۔ یہ مقام درخورِ قدومِ میمنت لزوم ہے اور یہ نہیں۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ ریاست خاک میں مل گئی ا بوئے ریاست ابھی باقی ہے۔ جاؤ ہمارا تمہارا ساتھ نہیں۔ ماتا جی اتنا کہہ کر چل کھڑی ہوئیں اور یہ سب کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ جب ان کے بغیر نہ رہ سکے تو پیچھے پیچھے ہو لئے۔ پر کچھ فاصلہ سے۔ تھوڑی دور جا کر دلی نے مڑکر دیکھا تو سب جاں نثار جان کے ساتھ دیکھے۔ قریب بلایا اور کہا۔ ہم اپنے دن گذار رہے ہیں۔ اپنا وقت پورا کر رہے ہیں۔ ادھر اُدھر اُٹھ بیٹھ کر غم غلط کرتے ہیں۔ ہم تم کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ آؤ ہمارے ساتھ آؤ۔ آئندہ احتیاط رہے۔ احسان مندوں نے قدم چوم لئے۔ تھوڑی دیر میں دہند بیگ خاں کا کٹرہ آیا۔ اور یہ سب استاد محمد بیگ کے کمرہ پر جا پہنچے۔

زمانہ بھر کے آزاد منش۔ تیز طبع حاضر جواب جمع ہیں۔ زبان درازی۔ فقرہ بازی کا بازار گرم۔ ہر ایک کی زبان تیز طرار۔ تیغِ برّاں خنجر آبدار۔ آداب محفل نرالے ہیں۔ اس بزم کے انوکھے آئنے

والے ہیں۔ دعا سلام کا نام نہیں، تہذیب کا یہاں کام نہیں، نہ آداب
اخلاق سے سروکار۔ نہ مغلظات سے ان کو عار۔ آزاد ہیں پابند
نہیں، ان کے قول وفعل پر کوئی قید و بند نہیں، جو منہ میں آتا ہے
سو کہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے۔ کہ فقرہ چست ہو بندش درست
الفاظ چبھتے ہوئے، جواب کھبتا ہوا برجستہ۔ ایک طرف آزاد منش
رند مشرب بیٹھے ہیں۔ ایک طرف مست مولا مستان۔ اس محفل
میں امتیاز مراتب نہیں۔ امیر بھی ہیں، غریب بھی، فقیر بھی
ہیں۔ رئیس بھی۔ سب ایک حمام میں ہیں۔ اور ایک رنگ میں
میدان تمسخر میں سمند زبان گام زن ہے، ضلع جگت پھبتی کی
جولان گاہ میں کلیلیں کرتا پھرتا ہے۔ کسی نے فقرہ کسا اور سمند ناز
پر تازیانہ ہوا۔ ترارا بھرا آسمان کے تارے توڑ لایا۔ ایسا جواب دیا
کہ سب لاجواب ہو گئے۔ محفل سے تحسین و آفریں کا غلغلہ آسمان
تک پہنچا۔ ساکنانِ کرہ خاک کی داد فلک الافلاک پہ فرشتوں نے
دی۔ محفل جماؤ پر تھی کہ ایک صاحب کالے کلوٹے، موٹے
تازے، سفید پوش تشریف لائے۔ اہل محفل ان کی طرف دیکھنے

لگے۔ نو وارد سے معلوم ہوتے ہیں، استاد نے دریافت کیا۔

استاد۔ اسم گرامی ؟

نووارد۔ نام سے آپ کو کیا کام۔ جس کو زبان درازی کا دعویٰ ہو، مجھ سے زبان ملائے۔ مقابلے میں آئے۔

اُستاد۔ ابھی تو آپ آئے ہیں قابلہ کا بھی انتظام ہو جائے گا

نووارد۔ بھوکے تھے نہ، میم کھا گئے۔

استاد۔ میم کے معنی نہیں ہیں اور نہیں کا یہاں کام نہیں۔ ؎

اس نہیں کا کہیں جواب نہیں
روز کہتے ہو تم کہ آج نہیں

نووارد۔ معلوم ہوتا ہے شہر میں غلہ مہنگا ہے۔

اُستاد۔ جی ہاں۔ باہر کے گدھے آکر سب چر گئے۔ پر جناب کچھ فکر نہ کریں آپ کے راتب کا معقول انتظام ہو جائے گا۔

نووارد۔ آپ کسی اصطبل میں بھی بندھے ہیں یا نہیں۔

استاد۔ شاید جناب کھونٹا تڑا کر بھاگے ہیں جو نام نہیں بتاتے۔

نووارد۔ تم بڑے منہ زور ہو۔ کوئی اگاڑی پچھاڑی نہ ڈال دے۔

استاد۔ یہ وہی ہے جو کسی نے سواری گانٹھ لی تو ٹھوکریں کھاتے پھروگے

نووارد۔ ایسا تو میں بھی ہیینا نہیں ہوں۔ مجھے ڈر ہے۔ کوئی تمہاری مشکیں نہ کس لے، کبھی طویلہ کی بلا بندر کے سر جائے۔

استاد۔ ہیبنے کیوں ہونے لگے، خدانخواستہ تم نوخوید میں اترے ہوئے ہو۔ پر تم جیسے الل بچھیرے بہت سے کھڑ کھڑیہ میں جوت سیدھے کر دیئے۔

نووارد۔ کوئی تمہارے مضمنہ نہ لے ڈالے۔

استاد۔ ہمیں تو تھان کے ٹرتے معلوم ہوتے ہو۔ یہاں تو کچھ چوکڑی سی بھولے ہوئے ہو، ابھی نام تک تو تم نے بتایا نہیں، ایسے کھوئے گئے کہ نام بھی بھول گئے۔

نووارد۔ ایسا بھولا نہیں ہوں کہ نام بھول جاؤں۔ آپ جیسے دس بیس کو چرا کر چھوڑ دوں۔ میرا نام ہے شرافت۔

اہل محفل میں سے ایک۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔

نووارد۔ اسی وجہ سے میں نام نہ بتاتا تھا۔ یہ نام اس بزم خرافات کے قابل نہیں۔

استاد۔ چہ خوش چراا بنا شد۔ نام والا تو محفل میں آگیا۔ پر نام نہ آنے پائے۔ گرڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز۔

نووارد۔ جناب کو گرڑ۔ اناج اور غلہ وغیرہ سے بہت دلچسپی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی بقال کی نسل سے ہیں۔

استاد۔ اور آپ کسی نقال کی نسل سے ہیں۔ سلسلے دونوں ایک ہیں ذرا نقطہ کا اُل پل ہے۔ سو عاقلاں درپئے نقطہ می روند۔ اور جناب شر۔ آفت صاحب جہاں تک نام کا سوال ہے۔ یہ آپ کے لئے اختراع کیا گیا ہے اور آپ اسی نام کے لئے پیدا ہوئے ہیں،

اہل محفل۔ وہ کیوں۔

استاد۔ آپ لوگ سمجھتے نہیں، یہ جو بزرگ آپ کے روبرو بیٹھے ہیں فی الحقیقت شر اور آفت کا میل ہیں۔

نووارد۔ بس میل جول کی باتیں رہنے دیجئے، اب آپ کنی کاٹتے ہیں،

استاد۔ کنی نہیں کاٹتا۔ حضور میری مقراضِ زبان سلامت چاہئے۔ تھان کے تھان پھاڑ ڈالوں گا۔ آپ ہیں کس ہوا ہیں۔

نووارد۔ آپ تو خالی ہوا باندھتے ہیں۔ چلتی ہوا سے لڑتے ہیں۔

استاد۔ یہ جناب کا خیال خام ہے۔ یہ خادم تو آپ کے خاندان کا دیرینہ ہوا خواہ ہے حتیٰ کہ آپ کا نام بھی اسی ناچیز ہی نے رکھا تھا۔

اہل محفل۔ استاد آپ نے ان کا نام کیونکر رکھا تھا،

استاد۔ صاحب آپ لوگ نہیں جانتے جس طرح۔ شر۔ آفت صاحب سانولے سلونے، ماشاءاللہ کان نمک ہیں اسی طرح ان کے نام میں بھی صنعت تلمیح ہے۔ جناب کا اسم گرامی قصہ طلب شعر ہے۔

نووارد۔ ع دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز۔

استاد۔ دور سے بیٹھے آنکھیں دکھا رہے ہو۔ تما صے گاؤ دیدہ گاؤ زباں معلوم ہوتے ہو۔ زبان ملاؤ تو بتاؤں۔

اہل محفل۔ استاد ہم سب مشتاق ہیں ذرا وہ نام رکھنے کا قصہ سنا دیجئے

استاد۔ صاحبان ایک عرصہ کی بات ہے۔ مدتیں گذریں۔ زمانہ ہو گیا۔ ہماری جوانی تھی۔ پاؤں پر منگل سوار تھا سر پر سنیچر۔ دل میں آئی کہ چلو ہم بھی جہاں گشت بنیں۔ بسیروا فی الارض پر عمل کریں ذرا دنیا دیکھیں۔ سامان سفر تیار کر چل کھڑے ہوئے۔ نہ سدھ

بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی۔ نکل گھر سے راہ سیدھی جنگل کی لی۔ چلا چل چلا چل، راہ کی عمر کوتاہ اور چلنے والے کی عمر دراز، ایک مقام پہ پہنچے کہ نام تھا اس کا وحشی نگر۔ بانگڑ پور تعلقہ جہالت آباد۔ شہر میں قدم رکھتے ہی دماغ بوئے جہالت سے پراگندہ ہو گیا۔ لوگ گندہ دہن۔ کم رو۔ چھوٹے چھوٹے سر۔ حماقت مآب، جانگلو۔ احمق۔ خرنا مشخص۔ طبیعت تو وہاں پل بھی ٹھیرنا گوارا نہ کرتی تھی۔ پر کیا کرتا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ آفتاب سر بام تھا چھُپا ہو چلا تھا۔ رات سر پہ آ رہی تھی۔ ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی سرا ہے۔ تو عجب ادائے استغنا سے فرماتے ہیں، ہم تو گھر میں رہتے ہیں۔ میں نے عرض کی، خدا آپ کو گھر میں رہنا مبارک کرے، میں مسافر ہوں، تو ارشاد ہوا جمعرات کو آنا۔ قسمیہ آگ ہی تو لگ گئی، دل میں آیا اتنا جُتیاؤں کہ ساری عمر یاد کرے۔ اچھی جگہ سمجھ کر چپ ہو گیا۔ دل میں ٹھان لی، یا قسمت یا نصیب سرا ملے چاہے نہ ملے، اب کسی سے پوچھوں گا نہیں۔ تھوڑی

دور گیا تھا۔ مقدر سامنے تھا۔ سامنے سرا دکھائی دی۔ شکر باری تعالیٰ بجا لایا اور سیدھا بھٹیاری کے پاس گیا۔ کالی کلوٹی بیگن لوٹی ٹھنگری سی ایک عورت میلے وسمال کے رنگ کے کپڑے پہنے چولہے کے آگے بیٹھی روٹی پکا رہی تھی، ماتھے پر سے پسینہ بہ رہا تھا۔ یقین مانئے وہ بھی کالا۔ گلوری منہ میں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ڈائن ابھی ابھی کسی کا کلیجہ کھا کر آئی ہے۔ دل میں سوچا اگر مسافر کہتا ہوں تو یہ نیک بخت بھی جمعرات کی دعوت دینی ہے۔ چھٹتے ہی کہا، بی بھٹیاری ہم کو کمرہ چاہیئے۔ فرمایا کمرہ تو ہمارے پاس کوئی نہیں ہے۔ میں نے کہا یہ سرا ہے نہ۔ بولیں۔ جی سرا تو یہی باجے ہے، میں نے کہا رات کی رات گذارنی چاہتے ہیں۔ یہاں کہیں ٹکنے کو ٹھکانا ہے۔ بولیں ٹھکانا کیوں نہیں جی، ساری پوری سرائے حاضر ہے۔ پر کمرہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ میں نے کہا کمرہ نہیں ہے تو پھر تمہارے پاس ہے کیا بولیں۔ جی ہمارے پاس کٹھڑیاں ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا، ان کے پیچھے پیچھے کٹھڑیا میں گیا۔ پھوس کی چھت، کچی دیواریں۔ چاروں طرف سے بو اٹھ رہی۔ اس وقت وہ بھی غنیمت تھی۔ سوچا ایک رات کا

تو واسطہ ہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح گذار ہی دیں گے۔ میں نے کہا بی بھٹیاری ایک پلنگ بھجوا دو۔ بولیں جی پلنگ تو ہمارے ہاں کوئی نہیں، یہ سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، سوچا کہ رات کو زمین پر پڑنا پڑے گا۔ سانپ بچھو، کیڑے پتنگے کا ڈر۔ اب میں کھڑا بی بھٹیاری کا منھ دیکھ رہا ہوں۔ دل میں سوچتا ہوں کہ یہ اچھی سرا ہے۔ جہاں پلنگ نہ پیڑا۔ آخر مہر سکوت توڑی اور بولا۔ کیوں بی تمہارے دیس میں سب زمین پر سوتے ہیں؟ یہ سن کر بی بھٹیاری بہت بگڑیں۔ اور تیکھی ادا سے بولیں اے نوج دور پار زمین پر کیوں سونے لگے۔ ادھر کھٹیا کا رواج ہے۔ سو سب کھٹیوں پر سوتے ہیں۔ یہ سنکر جان میں جان آئی اور کہا ہم کو ایک کھٹیا بھیج دو۔ بی بھٹیاری نے اپنا راستہ لیا۔ اور ہم چوکھٹ پر ہو بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں ایک مرد سیاہ رو کچنا کا دیو کھاٹ سے کر آیا اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں بچھا۔ یہ جا وہ جا۔ قہر درویش بر جان درویش۔ میں بستر کر پڑ رہا، اب بھوک لگی طبیعت نہ چاہے کہ اس گندی کلوٹی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاؤں۔

بھوک بری بلا ہے۔ پیٹ کا پٹن ہیٹنا ضروری تھا۔ جب تقاضہ زیادہ شدید ہوا اور انتڑیاں قل ہواللہ پڑھنے لگیں تو ہم اٹھے اور بی بھٹیاری کے دربار میں پھر حاضر ہوئے، اور کہا ہم کو کھانا دو، بولیں کھانا تو ہمارے ہاں ہے نہیں، بھائیو میرا تو سانس رک گیا۔ سوچا کہ آج فاقہ سے پڑنا پڑا۔ خیر، جو کچھ خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا۔ نہایت حسرت سے میں نے بھٹیاری کی طرف دیکھا اور کہا "واہ بی بھٹیاری تمہاری سرا میں اور مسافر بھوکا سوئے، بولیں "اللہ نہ کرے آپ کے دشمن بیری بھوکے سوئیں۔ ہمارے ہاں کھانا نہیں ہے، جو دال روٹی حاضر ہے ابھی بھیجتی ہوں۔ میں نے پوچھا، کیوں بی یہاں کہیں حلوائی کی دکان بھی ہے، بولیں کیوں نہیں۔ سرا کے سامنے مٹھن حلوائی کی دکان ہے۔ وہاں ہمہ نیا مت موجود ہے، میں نے سوچا شکر ہے ایک بات کا جواب تو اس نیک بخت نے ہاں میں دیا۔ دل میں خوش کہ کچھ مٹھائی لے لیں گے، کچھ یہاں کی دال روٹی ہو گی، کام چل ہی جائے گا۔ سرا کے باہر آیا۔ سامنے لالہ حلوائی میلی چکٹ دہوتی باندھے ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ایک پٹڑے

پر بیٹھے ہیں۔ چاروں طرف تھال رکھے ہیں۔ پر کفِ مفلس کی طرح
خالی۔ میں نے سوچا مکھی بھُنگے خاک دھول سے بچانے کو مٹھائی
اندر الماریوں میں رکھدی ہوگی۔ ان سے پوچھا لالہ جی تمہارے
پاس کیا کیا مٹھائی ہے۔ بولے بھگوان کی کرپا سے سب کچھ ہے
آپ کو کیا چاہیئے، حکم کیجیئے۔ میں نے کہا ایک آدھ سیر گلاب جامنیں
دیدو۔ بولے "جی گلاب جامنیں تو ہیں نہیں۔ میں نے کہا، اچھا تو
امرتیاں تول دو"، بولے سرکار امرتیاں بھی نہیں ہیں۔ دل میں
سوچا کہ یہ چیزیں شہروں میں بنتی ہیں۔ یہاں ان کا گاہک کہاں
ایسی چیز ہے جو گاؤں گنویں میں بھی بنتی ہو۔ میں بولا، اچھا ایک
پاؤ سیر موتی چور کے لڈو اور پاؤ بھر ربڑی دیدو، انہوں نے بہت
عاجزی سے کہا، جی یہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے، میں نے کہا
تو پھر لالہ جی آپ کے پاس ہے کیا، بولے آپ کی کرپا سے
سب کچھ ہے، میں نے کہا، اچھا جی جو تمہارے پاس ہو وہ
ہی دیدو، لالہ بہت غُصّے سے اٹھے، اندر گئے۔ اور ایک گڑ
کی بھیلی اٹھا لائے۔ بولے، جی ہمارے پاس سب مٹھائیوں کا باوا

ہے۔ ہے لیجیے، یہ دیکھکر ایک پانچ سیر کی بھیلی سامنے رکھدی اور بولے، کتنا تولوں، میں نے کہا، بس معاف رکھیے، مجھے نہیں چاہیے، واپس سرا میں آیا۔ اپنے کمرہ میں پہنچا تو وہی کالا بھجنگ جو کھاٹ لیکر آیا تھا ایک طشتری میں دال اور ایک میں روٹیاں لئے کھڑا ہے۔ دونوں رکابیاں اس سے لیں اور صبر شکر کرکے کھانے بیٹھا۔ روٹیاں بالکل گندڈرے نہ کاٹے کٹیں نہ مارے مریں۔ ہر نوالہ توڑنا ردی سے لٹھم لٹھا کرنا تھا، پر یہ پیٹ سب کچھ کرواتا ہے۔ دوسری رکابی کو دیکھا تو اس میں دال۔ دال کیا، بس لسوت پانی مور کا آنسو۔ رکابی کی تہ تک دیکھ ڈالا۔ کہیں دال کا دانہ نہ ملا۔ بھائیو بھوک میں کواڑ بھی پاپڑ ہوتے ہیں، وہ روٹیاں اس دال کے پانی سے زہر مار کیں اور کھاٹ پر پڑ رہا۔

لیٹا ہی تھا کہ چاروں طرف سے مچھر حملہ آور ہوئے۔ واللہ اعلم یہ میرے خون کے کب سے پیاسے اس دن کی تاک میں بیٹھے تھے کہ میں غریب الوطن بے یارو مددگار ان کو ملوں اور یہ میرا لہو پی جائیں، جب ان کے کچوکے کھاتے کھاتے میرا بدن چھلنی ہو گیا تو چارو

ناچار اٹھا، بستر کھولا، ایک سفید چادر نکالی، ایک سرا پیروں تلے
دبایا۔ دوسرا سر کے نیچے، چاروں طرف سے اچھی طرح اس میں
اپنے آپ کو ملفوف کر لیٹ گیا۔ تکیہ پر سر رکھا ہی تھا کہ ایک
گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ میں کلمہ پڑھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھا شاید
بھونچال ہے۔ کمرہ سے باہر آیا تو دیکھا سرائیں سب پڑے سنّا رہے
ہیں۔ خیر خدا کا نام لے پھر اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو وہی آواز بجنسہ
موجود ہے۔ دل میں ڈرا کہ خدایا اس کمرہ میں کوئی جن ہے یا بھوت
جو ایسی قیامت خیز آواز نکال رہا ہے۔ یا روز رستخیز آ پہنچا۔
اور صور پھونکا جا رہا ہے۔ عقل نے کہا، پاگل ہوا ہے۔ اس آواز
سے تو مردے تک جاگ اٹھیں گے۔ اور یہاں تو زندے پڑے
سو رہے ہیں۔ کروٹ بھی نہیں لیتے۔ یہ صُور تو کسی صورت
نہیں ہو سکتا۔ دل نے کہا، تیرے کمرہ میں کوئی اژدھا بند ہے
اور یہ آواز اس کے سانس کی ہے۔ کچھ خون تو مچھروں کی نذر
ہو چکا تھا، رہا سہا اس خیال نے خشک کر دیا۔ کمرہ سے باہر آیا
اپنے گرد یاسین شریف کا حصار کیا۔ اب لکّاؤ تنہا سرا کی انگنائی

میں کھڑا ہوں اور کمرہ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں
سب آرام سے پیر پھیلائے سو رہے ہیں۔ اور میں فلک زدہ
زیرہ سا کھڑا تارے گن رہا ہوں۔ جب کھڑے کھڑے پیروں میں
خون اتر آیا تو سوچا کہ ساری رات تو اس طرح کھڑا رہنا محال ہے
کوٹھری میں رہا سلائی جلا کر دیکھ تو سہی آخر ماجرا کیا ہے۔ دل کڑا
کرکے کوٹھری کی طرف بڑھا۔ پیر زمین پکڑے لیتے ہیں۔ ایک
قدم آگے چلنے سے گریز پا ہیں۔ دل نے کہا چل بھی۔ ایسا بھی کیا ہے
ایک دن مرنا ہے۔ وقت سے پہلے آ نہیں سکتی۔ اور جو
تیری یونہی لکھی ہے تو ٹل نہیں سکتی۔ یہاں اگر کسی نے دیکھ لیا چور
سمجھ کر دھر والیا تو کوئی ضمانتی بھی نہیں ملے گا۔ چوکھٹ پر پیر رکھنا تھا کہ
وہی آواز پھر آئی اور میں پچھلے پیروں بھاگا۔ پاؤں کی آہٹ پاکر
ایک صاحب نے آواز دی، کون ہے بے، میں چُپ چاپ پھر اسی
کوٹھری کی طرف بڑھا، اب کے دل میں ٹھان لی کہ چاہے جان جائے
چاہے رہے کوٹھری میں جاکر دیکھوں گا تو سہی کہ آخر معاملہ
کیا ہے۔ ایک ایک قدم آگے بڑھا چوکھٹ پر پہنچا تھا کہ وہی آواز موجود

دل مضبوط کر، اللہ کا نام لے اندر قدم رکھا۔ دھیرے دھیرے چرپائی تک پہنچا، سرہانے سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھائی سلگانی چاہتا تھا کہ ڈبیا ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس وقت مجھے اپنی مصیبت پر رونا آگیا۔ اندھیری کوٹھری میں کھڑا ہوں اور اس اژدہے کی آوازیں جگر کے پار ہوئی جا رہی ہیں۔ ہر دم یہ خیال کہ اب اس نے مجھے کھایا اور اب کھایا۔ دیا سلائی کی ڈبیا پیروں میں پڑی ہے پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ زبان پر اللہ کا نام ہے۔ ہاتھ پیروں میں لرزہ، قضا سر پہ کھیل رہی ہے۔ بھائیو آدمی سا سخت نہ آدمی سا نرم جیسی پڑتی ہے ویسی اٹھاتا ہے، چار و ناچار ڈبیا زمین پر سے اٹھائی، دیا سلائی روشن کی، چاروں طرف نظر دوڑائی کچھ دکھائی نہ دیا۔ کونہ کونہ ٹٹولا کہیں اژدہے کا نشان نہ پایا۔ اب ذرا دل کو ڈھارس ہوئی، آواز کو غور سے سنا تو ایک دیوار میں سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بسم اللہ کر اس دیوار کی طرف بڑھا خیال صحیح ثابت ہوا۔ آواز بے شک اس دیوار ہی میں سے آرہی تھی غور کیا تو معلوم ہوا کہ پڑوسی صاحب خواب خرگوش میں ہیں۔ اور خراٹے فرما رہے ہیں۔ دل چاہا کہ اس ناشدنی کو ایسی نیند سلاؤں

کہ پھر کبھی کسی بھلے آدمی کی نیند نہ خراب کر سکے۔ اس پاجی پڑوسی کی جان پر صبر کر پھر اوڑھ لپیٹ پڑ رہا۔ سوچا عجب کم بخت منحوس مقام ہے، جہاں خواب و خور تک حرام ہے۔ صبح ہوتے ہی ہمارا سلام ہے۔ اور پھر اگر ادھر کا رُخ کریں تو ہم پر تین حرف۔

ذرا پلک سے پلک جھپکی تھی کہ شور و شغب کی آواز سے پھر آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ایک شور قیامت بپا ہے۔ سوچا کہیں ڈاکہ پڑا۔ نقب لگی یا کوئی خون کی واردات ہو گئی۔ کلمہ پڑھتا آنکھیں ملتا باہر نکلا۔ دل کہے سو بھی، تیری بلا سے کچھ بھی ہو، انسانی ہمدردی کا تقاضا کہ خدا معلوم کوئی خدا کا بندہ، بیچارہ مصیبت کا مارا کس آفت میں ہو گا کسی کی جان خطرہ میں ہو گی۔ کسی کا مال، کسی کی ناموس لُٹ رہی ہو گی، چل ان چلتے ہاتھ پیروں سے کسی کا بھلا ہو جائے تو اچھا ہے سب سونے والوں کو دل میں بُرا بھلا کہتا جدھر سے آواز آ رہی تھی اس طرف چل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دور پر ایک ٹوٹا سا گھر تھا اس کے باہر لوگوں کا مجمع اور اندر سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں چلی آ رہی تھیں۔ عورتیں بھی چلا رہی تھیں، مرد بھی

بڑکار رہے تھے۔ اس گروہ میں ایک صاحب قدرے معقول صورت نظر پڑے۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے، یہ لوگ کیوں لڑ رہے ہیں۔ بولے صاحب ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ میں نے کہا، خدا مبارک کرے، شادیانہ بجائیں۔ ہیجڑے بھانڈ نچائیں ستورہ پنجیری کے کڑھاؤ چڑھائیں۔ اس میں لڑائی جھگڑے کی کیا بات فرمایا صاحب کل اس کا عقیقہ ہے، میں نے کہا فبہا، عزیز اقربا کو جمع کریں اپنے پرایوں کو بلائیں۔ ولیغیں دم کروائیں۔ کلام پاک میں سے نام نکالیں۔ یہ کٹم کٹا کس لئے۔ انہوں نے کہا جناب نام ہی کا تو سارا جھگڑا ہے۔ ہم لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک شخص چلغوزہ کی قطع کا۔ اخروٹ سا سر۔ کشمش سی آنکھیں پستہ سی ناک۔ منہنی، مردہ مال، برے حال، برے احوال، سوکھا چھوارا نچا کھچا، تمام منہ پر نہتوں کے نشان، ہاتھ لہو لہان، کپڑوں کی دھجیاں اڑی ہوئی اس گھر سے باہر نکلا۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت لڑکے کے والد ہیں۔ میں نے دل میں سوچا عجب قیامتی لڑکا ہوگا جس نے پیدا ہوتے ہی یہ غضب ڈھایا۔ ماں باپ میں فساد ڈلوایا۔ ہاتا پائی

جوت پیزار تک نوبت آئی۔ سارے گاؤں میں رسوائی، نک کٹائی ہوئی۔ میں لطور ہمدردی اس شخص کے پاس گیا اور کہا صاحب یہ کیا ماجرا ہے، بس اتنا پوچھنا تھا کہ وہ پھٹ پڑے۔ وہی مضمون ہوا۔ ع ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو۔ بولے۔ صاحب میری لگائی بلائے بے درماں ہے۔ آفت ہے۔ مصیبت ہے۔ پتہ نہیں کمبخت میں کسی بھتنی کا میل ہے۔ کسی چڑیل، چھل پیری کی اولاد ہے۔ خدا معلوم اس پر کیا خدا کی مار ہے ذرا سی بات میں اپنے سے باہر ہو جاتی ہے۔ دیکھئے تو میرا کیا حال کیا ہے۔ تف ہے مجھ پر جو آج سے میں اس سے کوئی واسطہ رکھوں اس بے ایمان کو ابھی کھڑے کھڑے نکالتا ہوں" یہ الفاظ منھ سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ اندرون خانہ سے آواز آئی۔ بڑا نکالنے والا۔ ارے تجھکو نکال کر چھوڑوں گی۔ مونڈی کاٹے، دیکھتا رہ تیرا جنازہ نکلے گا یہاں سے پچھتاتا ہوا۔ لو غضب، اندھیر، یہ مجھے گھر سے نکالے گا، خاک میں ملا دوں تجھے اور تیرے گھر کو۔ بڑا گھر والا نکلا ہے" آواز کچھ ایسی مہیب تھی کہ میں بھی سہم کر رہ گیا۔ اور اس چلغوزہ

کی قطع کے آدمی سے پوچھا کہ آخر یہ سارا جھگڑا ہے کس بات پر،
بولا، صاحب کیا بتاؤں۔ ناحق کی ترپاہٹ کر رہی ہے، اچھا آپ ہی
بتائیے لڑکے کا نام باپ پر ہونا چاہیے یا ماں پر۔ میں کہتا ہوں یہ لڑکا
ہے، اس کا نام میں اپنے نام پر رکھوں گا۔ لڑکی ہوگی تو تجھے اختیار
ہے، جو چاہے سو نام رکھیو، اس اوندھی کھوپری نے پاکھنڈ مچا رکھے
ہیں، کہتی ہے ہوتی نہیں جو تیرے نام پر نام ہو جائے۔ میرا لڑکا ہے
تو ہوتا کون ہے اس کا نام رکھنے والا۔ اتنے میں اندر سے پھر وہی
بھیانک آواز آئی۔" لڑکا میرا ہے۔ میرا ہے۔ میرا ہے۔ ڈنکے کی
چوٹ میرا ہے۔ ہزاروں لاکھوں میں میرا ہے۔ تجھے اٹھنے ڈھائی
گھڑی کی، تجھے لے جائے نتواں، بڑا لڑکے والا بنا ہے، ارے
تیری سات پشت میں بھی کسی کے ہاں لڑکا ہوا تھا" میاں چلغوزہ
بولے" دیکھی صاحب آپ نے اس کی زبان! ڈھائی ہاتھ کی ہے ڈھائی
ہاتھ کی۔ اس کی باتیں سنتے سنتے میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ بس اب مجھ میں
برداشت نہیں ہے" میں ان کا ہاتھ پکڑ اس مکان سے ذرا دور
لے گیا، کچھ دم دلاسا دیا۔ تسلی تشفی کی سمجھایا۔ میاں ذرا سی بات کا

تینگڑ بنانا کونسی عقل مندی ہے، تم ہی اس وقت طرح دے جاؤ۔ غصہ حرام شے ہے۔ لعنت بھی بھیجو۔ تھوک دو۔ اس وقت اس کی ضد ہو جانے دو، ایسا بھی کیا ہے، خدا دوسرا لڑکا دے گا۔ تم اس کا جو چاہنا نام رکھ لینا۔ خواہ مخواہ گھر بگڑ جائے گا۔ بہت بگڑ کر بولے، صاحب گھر جائے بھنگ کے بھاڑے ہیں۔ میری جوتی سے بگڑے چاہے رہے، لڑکے کا نام تو میرے نام پر ہوگا۔ کیوں صاحب میں باپ ہوں، میرا اتنا بھی حق نہیں،، جب میں نے دیکھا کہ یہ ضد کا پورا ہٹ کا پکا۔ مریم پیٹلیم نہیں کسی عنوان ماننا ہی نہیں تو پوچھا "صاحب یہ تو بتائیے۔ جناب کا اسم گرامی ہے کیا" بولے "صاحب کیا اسم گرامی کیا نام نامی۔ بس ایک مصیبت ہے۔ خدا جہنم نصیب کرے، ماں باپ کو، کمبختوں نے ایسا نام رکھا ہے کہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ اگر اس وقت زندہ ہوتے تو بوٹیاں کاٹ ڈالتا بوٹیاں" میاں چلغوزہ کچھ ایسے تاؤ میں آئے کہ آنکھیں لال ہو گئیں۔ منہ میں جھاگ آ گئے۔ میں نے بمشکل ٹھنڈا کیا۔ کہا "پاگل ہوئے ہو، جہنم میں گھر بنا رہے ہو، خدا سے ڈرو ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا بھی کیا ہے مجھے بتاؤ تمہارا کیا نام ہے؟"

ع ہم سے نہ چھپا ظالم ہم یار ہیں یاروں کے۔ بولے "گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل، آپ پوچھے بغیر تھوڑی مانیں گے۔ صاحب بات یہ ہے کہ میرے ماں باپ کے ہاں اولاد جیتی نہیں تھی۔ کئی بچے ہوئے اور ہٹ ہٹ گئے۔ جب میں ہوا تو ایک فقیر صاحب نے بتایا کہ بچہ کا نام ایسا بُرا رکھو جو موت کو پسند نہ آئے، شاید اس طرح تمہارا بچہ بچ جائے، باوا جان نے سوچ کر میرا نام 'شر' رکھا اس سے سب الحذر کرتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں میری گھر والی کے ماں باپ رہتے تھے، اور ان کے بچے بھی مر مر جاتے تھے، جب یہ کمبخت نا شدنی پیدا ہوئی تو انہوں نے بھی ہماری دیکھا دیکھی اس کا نام "آفت" رکھا۔ خدا کا کرنا ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔ اب ہمارے ہاں خدا نے لڑکا دیا۔ آپ ہی انصاف سے بتائیے۔ پہلی پلوٹھی کا لڑکا۔ باپ کے نام پر اس کا نام نہ رکھا جائے تو ہے نہ بدنامی کی صورت۔ اور وہ نیک بخت کسی صورت راضی نہیں ہوتی، اپنی ہٹ پر اڑی بیٹھی ہے۔ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے پر کیا مجال جو وہ ناکہن اپنے کہے سے ٹل جائے" یہ سارا واقعہ

سن کر بے ساختہ زبان پر آیا۔ ایں خانہ تمام آفتاب است، باپ "شر" ماں "آفت" بیٹا "قیامت"! پر ضبط سے کام لیا۔ دماغ پہ زور دیا کہ ان کی اولاد کے واسطے کیا نام مناسب ہے۔ قسمت کی بات خدا کو بات رکھنی تھی، ایسا نام سوجھا کہ میں پھڑک اٹھا، بولا۔ لاؤ استاد قورمہ کا ہاتھ! قسمیہ اس وقت ایسا نام خیال شریف میں آیا ہے کہ سن کر پھولے نہیں سماؤ گے، بولے کیا نام، میں نے کہا نام۔ ایسا نام کہ تم بھی خوش تمہاری گھر والی بھی خوش، پر ویسے ہی تھوڑی بتائیں گے۔ پہلے یاروں کی مٹھی گرم کرواؤ۔ خیر دینا دلانا تو ان کو کیا تھا۔ جب بیچارے بہت منت سماجت خوشامد درآمد کر چکے تو ہم نے کہا۔ یار تمہارا نام "شر" تمہاری بیوی کا "آفت" تمہاری اولاد کا نام "شرافت"۔ سب سننے والے میرا منہ تکنے لگے، اکثر نے قدم لئے۔ جھگڑا چکا، قصہ پاک ہوا۔ ان صاحبزادہ کا نام شرافت قرار پایا۔ سو بھائی یہ نام اس ناچیز کا اختراع کردہ ہے"۔

یہ سن کر بزم میں قہقہہ پڑا۔ نووارد صاحب جو بے چین سے ہو رہے تھے تاب نہ لا سکے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اہل محفل نے

کہا، تشریف رکھئے، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

ابھی آئے ابھی بیٹھے ابھی دامن سنبھالا ہے
تمہاری جاؤں جاؤں نے ہمارا دم نکالا ہے

دم کے دم تو ٹھیریئے، ذرا تو دم لیجئے، پر وہ ان دم دلاسوں میں آنے والے نہ تھے، اُن کے دم پر بنی تھی۔ جوتیاں لے یہ جا وہ جا۔ ع ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا۔

آؤ نواب ضیاؤ الدین خاں والی لوہارو کے ہاں چلیں، بچکڑوں کی محفل دیکھ لی، اب شرفا کی بزم ایک نظر دیکھیں۔

رئیس کی محفل ہے۔ سر تاجدار کا دربار۔ خود عالم ہے، اور علماء کا پرستار۔ ثقہ محفل ہے۔ ادب آداب کا خیال، حفظِ مراتب کا لحاظ۔ اہل علم اور اہل کمال جمع ہیں

اسد اللہ خان غالب نواب صاحب کے قریب تشریف فرما۔ اس خاندان کے ان پر متعدّد احسان ہیں،

نظم و نثر غالب بھی نواب ضیاؤ الدین خاں صاحب کے پاس رہتی تھی۔ غدر پڑا۔ نظم و نسق دہلی درہم برہم ہو گیا، نواب صاحب

کا کتب خانہ، جس کی بابت غالب نے کہا ہے، "ڈر کر عرض کرتا ہوں بیس ہزار کی مالیت کا ہو گا" ورق ورق ہو گیا۔ نظم غالب منتشر ہوئی، نثر پریشان۔

ایک جانب استاد میر جان تشریف فرما ہیں۔ چز ورسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ہندوستان بھر میں ان سے بڑھکر کنجوس مکھی چوس ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا۔ کوڑی کوڑی پر جان دیتے ہیں، آدھی آدھی جوڑ کر رکھتے ہیں۔ اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے، پر موٹا جھوٹا کھاتے پھٹا پرانا پہنتے ہیں۔ تھوک لگا لگا کر روپیہ جوڑتے ہیں، لوگ صبح ہی صبح ان کی شکل دیکھنی پسند نہیں کرتے، جتنے کہ کسی گھر میں نہار منھ ان کا نام بھی نہیں لیا جاتا، مبادا فاقہ پڑ جائے۔ اہل محفل میں سے ایک صاحب نے مسکرا کر استاد سے کہا۔

ایک صاحب۔ کیوں استاد آپ کو روپیہ سے اس قدر اُنس کیوں ہے۔

استاد۔ صاحب زردی کی زردی دیکھ کر میری آنکھوں میں نور آتا

ہے دل میں سرور آتا ہے۔

ایک صاحب۔ مانا۔ پھر بھی اس درجہ اس کے درپے ہونا یعنی چہ ؟

استاد۔ بندہ نواز ایسا کون ہے جو مبلغ علیہ السلام سے مُستغنی ہو اور ان حضرت کے حصول کے درپے نہ ہو۔

ایک صاحب۔ دُنیا روپے کو دوسرے مقاصد کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اور جناب نے اس کو اصل مقصد قرار دے رکھا ہے۔

استاد۔ صاحب آپ کو اچھا کھانے اچھا پہننے میں مزا آتا ہے۔ یہ ناچیز روپیہ کے ڈھیر دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ جناب کو محفل رقص و سرود میں لطف آتا ہے، مجھے روپیہ کی جھنکار کا ترنم بھاتا ہے۔ اپنا اپنا مزا الگ الگ ہے۔ میرا لطف تو غلط اور جناب کا صحیح۔ یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ آپ کا شوق مسلم الثبوت اور میرا شوق حرفِ غلط، یہ کہاں تک جائز ہے۔ یہ سلسلہ گفتگو جاری تھا کہ اہل محفل میں سے ایک اور صاحب بولے اللہ اس بحث مباحثہ کو ختم کیجئے۔

اُستاد۔ واہ میر صاحب! تبادلہ خیالات میں کیا مضائقہ ہے۔

میر صاحب۔ استاد اسی تبادلۂ خیالات کی بدولت اور آپ کے مولویوں کی کٹ حجتیوں کے سبب اکبر ملحد ہو گیا تھا۔

یہ سن کر نواب ضیاؤ الدین خاں صاحب جو تاریخ دانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے چونکے اور بولے۔

نواب صاحب۔ میر صاحب آپ کیا فرماتے ہیں۔ اکبر مسلمان تھا اور مسلمان مرا ہے،

میر صاحب، بندہ نواز! دین الٰہی قائم کرنے کے باوجود آپ اکبر کو مسلمان کہتے ہیں،

نواب صاحب۔ بیشک دین الٰہی میں اکبر نے خدائی کا دعوے تو نہیں کیا اپنے کو مجتہد، امام، مجدد بتایا ہے۔ سو اس کی بنا پر آپ اسے خارج از اسلام تو نہیں کر سکتے،

میر صاحب۔ اور وہ خطبہ جو اکبر نے مسجد میں پڑھا ہے۔ اس کی بابت جناب کیا فرماتے ہیں۔

نواب صاحب۔ جی ہاں اس خطبہ پر بڑی لعن طعن ہوتی ہے، جناب کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ خطبہ شروع کن الفاظ سے ہوتا ہے

میر صاحب۔ مجھے الفاظ یاد نہیں آپ فرمایئے۔

نواب صاحب۔ خداوندے کہ مارا خسرو داد، چھٹتے ہی ایک بالاتر ہستی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کی وحدانیت پر زور دیتا ہے۔ اس کے اکرام کا اظہار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ خطبہ اکبر نے خود نہیں پڑھا۔

میر صاحب۔ خود اس لئے نہیں پڑھا کہ مجمع کا رعب غالب آگیا۔ ہاتھ کانپنے لگے، زبان نے ساتھ نہ دیا۔

نواب صاحب۔ بجا ارشاد ہوا۔ اکبر پر اور مجلس کا رعب طاری ہو جائے جس کو ہم بارہا تیس تیس اور چالیس چالیس ہزار کے جم غفیر کے روبرو تقریر کرتے ہوئے پاتے ہیں، جو میدان جنگ میں مٹھی بھر آدمیوں کو لیکر بڑے سے بڑے لشکر جرار پر جا پڑتا ہے زورِ زبان سے ان کی ہمت بڑھاتا ہے۔ بندہ نواز حقیقت یہ ہے کہ وہ خطبہ ایک لا مذہب کا لکھا ہوا تھا، خدا پرست کی زبان اسے پڑھنے سے قاصر تھی۔ اکبر پر مجمع کا رعب نہ تھا رعب تھا اس ذات ذوالجلال اور قوت لایزال کا

جس کی عظمت وشان اس کے دل و دماغ پر تسلط کئے ہوئے تھی اور اس کے خوف سے اکبر لرزہ براندام تھا۔ نہ کہ دو چار ہزار کے مجمع کے رعب سے۔ ایک دہریہ کے لکھے ہوئے خطبہ کا وہ حصہ جہاں وہ صراطِ مستقیم کو چھوڑ دیتا ہے ایک دہریہ ہی کی زبان سے پڑھا گیا۔ خدا پرست اور خدا ترس کی زبان سے نہیں۔

میر صاحب۔ بہرحال وہ خطبہ اکبر کی اجازت سے پڑھا گیا اس لئے اکبر موردِ الزام ہے۔

نواب صاحب۔ میر صاحب بات یہ ہے کہ اکبر طبع متجسّس لیکر پیدا ہوا تھا۔ ہر معاملہ کی تہ کو پہنچنا چاہتا تھا۔ دربار میں شیعہ سنی اور ہندؤں کی آپس کی گفتگو نے مباحثہ کی شکل اختیار کرلی۔ ابوالفضل اور فیضی ملحد، لامذہب، شیخ مبارک کی اولاد، مولویوں کے زخم خوردہ، مذہب سے متنفر دربار میں دخیل ہوئے، اور ان صحبتوں میں مذاہب کا مذاق اڑانے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر مولویوں کی کج بحثی اور ابوالفضل و فیضی

کے تیز تیز فقروں کی بدولت راہِ راست سے بھٹک گیا،
اور مذہب کا احترام اس کے دل سے کم ہوگیا، اس دور
میں اکبر کے اقوال اور افعال میں الحاد اور لامذہبیت کا رنگ
جھلکتا ہے، لیکن اس کو مذہب سے جو ایک نسبت ازلی ہے
اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی، اور آپ کے بقول لامذہب
اکبر ایک مذہب کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں وحدانیت بدرجۂ اتم
موجود ہے۔

میر صاحب۔ وحدانیت موجود ہے۔ پر جیو ہتیا کے خلاف احکام
جاری کئے جاتے ہیں جن کی بنا پر آج جینی اکبر کو اپنے میں
سے بتاتے ہیں۔

نواب صاحب۔ میر صاحب یہ سب اوپری اور سطحی باتیں ہیں، جو آپ
نے دیکھی ہیں یا سنی ہیں۔ جب غور سے دیکھئے تو یہ سب رعایا کو
خوش کرنے کا ایک ڈھونگ ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ جیو ہتّیا کی
مخالفت کرتا ہے۔ اور جنگ اور شکار میں اجازت دیتا ہے،
جس کے معنے یہ ہوئے کہ ضرورتاً۔ تفریحاً اور لذت طعام نیز

کے لئے جیو مقیبا جائز رکھتا ہے۔ اسلام بھی اس سے زیادہ کی کب اجازت دیتا ہے۔ علاوہ ازیں شہر قصائیوں کی دکانوں سے بھرا پڑا ہے۔ دن رات کھلے خزانہ سر بازار گوشت فروخت ہو رہا ہے۔ اور اکبر روکتا نہیں۔ بندہ نواز نظر غایت سے دیکھئے تو یہ سب باتیں ہندو رعایا کی دل جوئی کے واسطے تھیں،

میر صاحب۔ اچھا یہ سب کچھ تو اکبر ہندو رعایا کی دلجوئی کے واسطے کرتا تھا پر عیسائیت کی طرف میلان کس کو خوش کرنے کو تھا۔

نواب صاحب۔ اکبر مذہب سے خالی الذہن تو کبھی بھی نہ ہوا۔ ایک عرصہ ایسا بیشک گذرا جبکہ وہ کسی خاص مذہب پر قائم نہ تھا۔ اس دور تذبذب میں ہر مذہب نے اکبر کو اپنے حلقہ میں لینا چاہا اور خود اکبر نے مذہب کو آلہ کار بنا لیا۔

میر صاحب۔ اچھا عیسائیوں سے اکبر کی کونسی غرض اٹکی پڑی تھی۔ جو اُدھر ڈھل گیا تھا۔

نواب صاحب۔ اکبر کا ارادہ ہندوستان کے ساحل کو پرتگالیوں کے اثرات سے پاک کرنے کا تھا اور اس کے واسطے بیڑہ کی ضرورت

تھی۔ ہندوستان میں بحری فوج تیار کرنے کی قابلیت کسی
میں نہ پائی۔ اس وجہ سے اہل مغرب سے سلسلہ جنبانی کی
ع تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے، لا سہ یہ دیا کہ عیسائیت
کے اصول سمجھنے چاہتے ہیں۔ پادری وہاں سے دوڑ پڑے
کہ پھنسا ہے بڑا شکار۔ سارا قصہ یہ تھا،
میر صاحب۔ پر اس وقت کے پادری لکھتے ہیں کہ عیسائیت کی طرف مائل تھا
نواب صاحب۔ بیشک وہ یہ لکھتے ہیں کہ اکبر عیسائیت کی طرف مائل تھا
اور وہ جھوٹ بولنے والے لوگ نہ تھے۔ پر ساتھ کے ساتھ یہ بھی
تو لکھتے ہیں کہ تثلیث کا قائل نہ ہوتا تھا۔ اب فرمائیے۔ میں اگر
یہ کہوں کہ میر صاحب کو میں نے اسلام کی طرف رغبت دلائی
ہے۔ پھر وحدانیت پر آکر بدک جاتے ہیں تو وہ رغبت کس کام کی
ہوئی۔ جب بنیادی اصول نہ مانا۔ جہاں تک اخلاقیات کا
سوال ہے۔ وہ تمام مذاہب میں تقریباً ایک ہی سے ہیں
اعتقادات بیشک جداگانہ ہیں اور ان ہی کے رد و بدل سے
تبدیل مذہب ہوتی ہے۔ جب تثلیث کا قائل نہ ہوا تو عیسائیت

پر مائل کیا ہوا۔ یہ سب ڈھکوسلے تھے اور آخر میں جہانگیر صاف لکھتا ہے کہ اکبر توبہ کر کے مسلمان مرا ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک چیلے نے جوگن جی سے جھک کے کچھ کہا۔ انہوں نے سر ہلایا اور کہا "بے شک اس وقت وہاں رنگ ہوگا" اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہمراہیوں کی طرف منہ کیا اور کہا آؤ تمہیں ایک میخوار کی صحبت دکھائیں۔ تاجدار مکان ہے۔ سامنے لبریز حوض حوض کے بیچ میں فوارہ جام مے کی طرح چھلکا پڑتا ہے۔ گرداگرد تنوار روشنی کی گئی ہے۔ مکان جگمگا رہا ہے۔ آگے پائیں باغ لالہ جام در دست، گلاب گلابی لئے۔ نونہالانِ چمن مست و مخمور جھوم رہے ہیں۔ سبزہ کا منہ چوم رہے ہیں چشم مے خوار نرگس بیمار لڑکھڑا رہی ہے۔ باد بہاری مستانہ وار آ رہی ہے۔

بزم مے ہے۔ جام و مینا سجے ہیں۔ گلہائے خوش رنگ و خوشبو کے انبار، عطر دان کھلے دھرے ہیں۔ گلاب پاش بھرے رکھے ہیں۔ عود سوز سلگ رہے ہیں، دھواں مستانہ وار اٹھتا ہے اور مینا کا طواف کرتا گذر جاتا ہے۔

شمع کے گرد پروانہ۔ مست مستانہ، سرگشتہ و دیوانہ، آگ سے کھیل رہا ہے۔

آب آتش کا دور چل رہا ہے۔ شعلہ آشام دو آتشہ اور سہ آتشہ سے دل کی لگی بجھا رہے ہیں، کدورت کا یہاں نام نہیں۔ انقباض کا کام نہیں۔

صاف دل، پاک دردوں جمع ہیں۔ کھل کھیل رہے۔ جن سے دل کھلی ہے، وہی موجود ہیں۔ پہلے ساقی کے نام کی زمین پر گرائی، پھر شغل شروع ہوا۔ جوان سفید رنگ کی پی رہے ہیں۔ سال خوردہ سرخ۔ ساقی سیم ساق، مزاج داں، طبع شناس گلاب و بیدمشک ملا کر لایا ہے۔ حسینان مخمور چشم خدمت کو حاضر۔

مطرب خوش نوا ساز سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔

دلی ماتا یہ رنگ دیکھ رہی تھیں کہ منجم قدرت تھرا اٹھا۔ آسمان کی طرف نظر ڈالی اور کہا۔

بزم مے سے ہے نگہ تفرقہ انداز نہ ڈال
اتفاقات سے ہو جاتے ہیں احباب بہم

جوگن جی نے پوچھا کیا ماجرا ہے۔ جواب دیا۔ فلک کینہ پرور چشم حسد سے دیکھ رہا ہے۔ یہ کوئی دن کا میلہ ہے۔

دلی ماتانے اس بھری پُری محفل کو بہ نظر حسرت دیکھا۔ اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

چار بجے ہیں۔ گجر بج رہا ہے۔ انجمنِ انجم بے رونق ہو چلی ہے زہرہ مشرق کی جانب جلوہ گر ہے۔ محفل رقص و سرود میں کھردے کی نیاری ہے۔ بھیرویں کی تانیں اُڑ رہی ہیں۔ شب بیداری کے آثار اہل محفل کے چہروں سے نمایاں۔ کچھ گُمسا رہے ہیں، کچھ جانے کو بیٹھے پر تول رہے ہیں۔ ارباب نشاط اجازت چاہ رہے ہیں محفل کی طرف سے ایک آخری چیز کی فرمائش ہے، یہاں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوگئے۔ کسی کر کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی

بھری محفل میں کہتی ہے نگاہ مست ساقی کی
کہ یوں گردش میں جام بے خودی انجام آیا ہے

ادھر یہ حال ہے

ہجوم عام میں رخسار یار کے بوسے مری نظر نے نگاہیں بچا بچا کے لئے

جوگن جی نٹوں کے کوچہ میں خواجہ امان کی محفل میں آئیں، اس کو بزم خموشاں کہتے ہیں۔ اور اس وقت آراستہ ہوتی ہے۔
سلام نہ دعا، آداب نہ بندگی۔ مجرا[1] نہ کورنش۔ جس کا دل چاہے آئے۔ جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے۔ نہ آنے والے کا خیر مقدم، نہ جانے والے کو خیر باد۔ عجب رنگ کی محفل ہے۔ عجب ڈھنگ کے آداب۔ صدر میں خواجہ صاحب گاؤ تکیہ سے لگے ستار سامنے رکھے ٹھاٹھ جمائے بیٹھے ہیں۔ سامنے صراحی گلاس رکھا ہے نہ تو پردہ ہے نہ حجاب ہے، ان کا قول ہے، ع خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندوں کی کیا چوری۔ جوڑ[2] بجانے میں دور دور ان کی جوڑ نہیں۔ جوڑی والا فریب دانیاں بانیاں لئے بیٹھا ہے۔ موسیقی دانوں میں ان کا ڈنکا بجتا ہے۔ سُر اس قیامت کا کام کرتے ہیں کہ دوسرا ٹک نہیں سکتا۔ آج ان کے دم سے سُر کا سنگار[3] رہے۔ یہ جب نہ ہوں گے بین[4] بین کرے گی۔ ستار تار تار، گلو بریدہ ہوگا۔ طبلہ ول داغ وار

---

[1] ستار کے ایک حصہ کو کہتے ہیں۔ [2] ستار کی اصطلاح ہے۔ [3] سُر سنگار ایک قسم کا باجا ہے۔ [4] ایک قسم کا ساز ہے۔ [5] ستار کے ایک حصہ کا نام ہے

لیے سینہ کوبی کرنا پھرے گا۔ اہل محفل زینت وہ محفل ہیں۔ شوقین دھن[1] کے پکے امنڈ امنڈ کے آن پہنچے۔ میر ناصر احمد بھی ایک طرف بیٹھے ہیں، ان کی بابت صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ مرزا کالے کے استاد ہیں۔ آپ خود سمجھ جائیں گے کہ کس پائے کے استاد ہیں۔

خواجہ صاحب نے ایک جام نوش جان فرمایا۔ اور ستار ملایا صبح کی اذانوں تک یہ محفل برقرار رہی۔ ادھر اللہ اکبر کی آواز کان میں پڑی۔ ادھر خواجہ امان ستار چھوڑ جام سے منہ موڑ اٹھ کھڑے ہوئے محفل برخاستند۔

ولی ماتا وہاں سے سیدھی بلی ماروں اہلی والی مسجد میں آن پہنچیں دو رکعت نماز فرض قاری فخرالدین کے پیچھے ادا کی۔ اہل دہلی اور اہل ہند کو ان پر فخر ہے، ان کی ٹکر کا قاری بلاد اسلام میں مشکل سے نکلے گا۔

فرض ادا کر سیدھی ایک اکھاڑے پہنچیں۔ استاد منڈھے پہ بیٹھے داؤں بتا رہے ہیں۔ خلیفہ پٹھوں کو زور کرا رہے ہیں جس کے سانس بھر گئے اس نے عشق اللہ کی زمین پر ہاتھ رکھ ڈنڈ پیلنے لگا۔ استاد کی

[1] موسیقی کی اصطلاح ہے۔ ۱۲

سب پر نظر ہے۔ جو ذرا محنت سے الکسایا اس پر ڈانٹ پڑی، ایک
دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں اپنے کام سے کام رکھو
جو زور کرتا ہے استاد سے اجازت لیکر جو ردمالی باندھتا ہے ان سے
پوچھکر کسی نے داؤں اوچھا مارا اور استاد خفا ہوئے۔ اگر زیادہ
تاؤ آیا تو اُٹھ کر ایک چانٹا رسید کیا۔ پھر خود داؤں رواں کروایا
اس میں دس نکتہ بتائے۔ آخر میں تاکید کردی، اب کے بھولا تو یاد
رکھیو اٹھ اسکے دے ماروں گا۔ نئے پٹھوں کو رم پھرائی جا رہی ہے
کہ ان کا بدن ٹوٹے۔ سانس بنے۔ کوئی سی پی سے پسینہ سونت رہا ہے
کہیں دو جوان آمنے سامنے کھڑے سپاٹے کی بیٹھکیاں لگا رہے ہیں
لیجئے وہ مرزا علی جان بیگ اور حاجی جی جوتے والے آن پہنچے دد لوپ
مانے ہوئے استاد ہیں آج اس فن میں ان کا جواب نہیں۔ ساتھ ساتھ
سکھ دیو ہے۔ یہ حضور بہادر شاہ کا پہلوان ہے۔ پیچھے پیچھے صدیق
پہلوان بھی آن پہنچے۔ ان کا خرچ حضرت کالے صاحب اٹھاتے ہیں
استاد نے سب کی تعظیم دی۔ حقہ تازہ کروایا۔ اور اکھاڑے سے
ذرا دور بیٹھکر پینے لگے۔ ایک ایک پٹھے نے آ کر گھٹنے پکڑے بٹھیاں

بھریں۔ مرزا علی جان بیگ اور حاجی جی نے دعائیں دیں۔ ساتھ کے ساتھ ہدایتیں بھی ہوتی گئیں۔ کسی کو حکم ہوا تیاری کی بیٹھکیاں زیادہ لگایا کرو۔ جس کا اوجھ پڑا ہوا دیکھا، کہا بادام پیو۔ دودھ چھوڑ دو۔ کسی کو ارشاد ہوا۔ ہاتھ چوڑا کر ڈنڈ پیلا کرو، ایک کو کہا، اوپر اٹھتے وقت گردن تنی رہے۔ ذرا پیٹ کی نہیں کھچیں۔ کسی کو بکوں کی ہدایت ہوئی کسی کو ڈھیکلیاں لگانے کا حکم کہ بدن اڑنے لگے۔ چھوٹی جوڑیں زور کر چکی تھیں۔ اب بڑوں کا نمبر آیا۔ خلیفہ سب کو زور کرا رہے ہیں کسی کی گردن پر گھٹنا رکھکر سانس بھروا دئیے کسی سے سامنے کے زور ہوئے، دو پکڑیں ایسی ہوئیں کہ مزا آگیا۔ داؤں پھلجھڑیوں کی طرح چھٹے۔ پور پور پر داؤں ہوئے۔ بغلی بیٹھ کمر پکڑی۔ ٹنگڑی مار زمین پہ دے مارا۔ سینہ کا زور دیکر پھیلایا اور گھسے پر کھینچ گیا۔ استاد نے آواز دی۔ کندہ سینہ پر آئے، لڑ نتھیے لڑ رہے ہیں۔ کسرتیے کسرت کر رہے ہیں، استاد بیٹھے باتیں بنا رہے ہیں حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔

لیجیے وہ رستم ہند چلے آرہے ہیں۔ یہ مرد پہل پکڑ پیل مست کی دُم پکڑ لیتا ہے تو سکنے نہیں دیتا۔ زمانہ اس کی طاقت کا لوہا مانتا ہے

پنجہ پولاد سے طباقِ آہنی کے دو کر دیتا ہے۔ دنیا پر اس کی قوت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ شاہی سکہ کے حروف انگلیوں سے مسل کر مٹا دیتا ہے۔

دلی نے منجم قدرت سے دریافت کیا کہ ان استادوں اور پہلوانوں کا کیا حشر ہوگا۔ عرض کی حاجی شرف الدین کا نام مدتوں قائم رہے گا۔ اپنی یادگار اکھاڑے چھوڑ جائیں گے مرزا علیجان بیگ کے ساتھ دنیا پر داؤں کرے گی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ سکھ دیو کا سکھ دلی آباد کے ساتھ برباد ہو گیا۔ بے فکری اور پہلوانی کی جُٹ ہے۔ جب یہ لٹ گئی تو وہ بھی اُجڑ گئی۔ صدیق پہلوان مہاراج الور کی ملازمت کریں گے۔ دلی میں روٹی کے لالے پڑ جائیں گے، ان کی خوراک ٹھہرے بادام۔ میاں کالے صاحب ان کو مہاراج کی نذر کریں گے، وہاں ان کی پہلوانی فروغ پائے گی ان کے کارنامے زبانِ زدِ خلائق ہوں گے، اور ان کا نام ان کے بعد بھی زندہ رہے گا۔

اس کارخانہ تکوین و ایجاد میں کون رہا ہے اور کون رہ جائے گا

توقیعِ قضا یہی ہے۔ ؎

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا　　آدمی بلبلا ہے پانی کا

بیماری ایسی بری بلا ہے کہ ہاتھی کو بھی ڈھا دے۔ یہ مردِ پیل افگن ایسا بچھڑے گا کہ تین دن کی بیماری میں آنکھیں چھت سے لگ جائیں گی میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ پلنگ پر پڑا ہے اور لوٹی پٹی کے نیچے پڑی ہے کوشش کرتا ہے کہ اٹھالے پر اٹھا نہیں سکتا۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ سکہ کے حرف مٹا دینے والا دستِ قضا کے ہاتھوں حرفِ غلط کی طرح مٹایا جا رہا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِى الْاَبْصَارِ۔ بڑے سے بڑے تناور درخت کو ایک جھٹکے میں اکھاڑ پھینکنے والا بادِ فنا کے ایک جھونکے میں پتّہ سا اُڑ گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

دلی ماتا تھوڑی دیر ان پیل پیکر پہلوان کی کشتی دھینگا مشتی دیکھ چپ کھڑی ہوئیں، اور حاجی علیجان پٹوے کی گلی میں ایک مکان پر ٹھٹکیں۔ دروازہ پر پردہ پردہ داری کر رہا ہے، یہاں پردہ نشین خواتین رہتی ہیں۔ مصاحبین محل شناس بیرون خانہ ٹھہر گئے دلی ماتا گھر میں تشریف لے گئیں۔ گھر قرینہ سلیقہ سے سجا ہر شئے طریقہ سے رکھی ہے

بال بچے اِدھر اُدھر کام کاج کرتے پھر رہے ہیں۔ گھر کی بڑی بوڑھی دالان میں ایک تخت پر جا نماز بچھائے بیٹھی ہیں۔ چہرہ پر ایک دلالت ہے نیکی و پرہیزگاری۔ پاک دامنی و عفت شعاری۔ خداترسی و دینداری۔ ع جامہ بود کہ برقامتِ او دوختہ بود۔ شاگردیں اپنے اپنے سپارہ لیے سامنے سبق یاد کر رہی ہیں۔ محلہ کی ایک بڑھیا میلا برقع سر پر ڈالے تخت کے ایک کونے پر آن بیٹھی، اشارہ سے اپنے پاس بلایا۔ تسبیح ہاتھ سے رکھ پٹاری سرکا پان بنایا۔ گردی کے نیچے سے ایک روپیہ نکال پان کے ساتھ چپکے سے اس کے حوالہ کیا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔

دلی ماتا یہ تماشا دیکھ باہر آئیں۔ بھاٹ نے عرض کی کہ دورانِ غدر میں اس گھر کی حفاظت جانفشاں خاں کے سپاہیوں نے کی۔ محلہ کے غریب غربا اپنے بال بچوں کو لے ان کے ہاں آن پڑے۔ شہر میں جنس کا کال تھا۔ بازار بند پڑے تھے گھر میں بیٹی کی شادی کے چاول بھرے تھے ابال اُبال کر کھلانے شروع کر دیئے۔ ایک روز موقع پا میاں نے بیوی سے پوچھا کہ خاکروب نہ جاروب کش۔ حلال خوری نہ مہترانی۔ اور ماشاءاللہ محلہ کا محلہ گھر میں بیٹھا ہے۔ صفائی کا کیا انتظام ہوتا ہے بیوی نے

جواب دیا کہ رات کو جب سب سو جاتے ہیں تو میں اور لونڈی یہ کام انجام دے دیتے ہیں۔ یہ سن کر سب کی زبان پر تعریف کے کلمے آئے، منجم قدرت نے کہا کہ ان بیوی کی نیکی پیڑیوں تک ان کی اولاد کے آگے آئے گی۔ یہ باتیں کرتی ماتا جی جمنا کنارہ اپنے کنڈل میں جا پہنچیں۔ یہاں چاہتی جوگن کے چاہنے والے دیر سے جمع تھے۔ اہل کمال کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ ہر شخص منتظر قدم بوسی نظر کرم کا امیدوار۔ ماتا جی نے دربار میں قدم رکھا اور نقیب نے آواز دی۔ باادب۔ ہوشیار نگہ روبرو۔ سب حسب مراتب ہو بیٹھے۔ دربار جم گیا۔ منجم قدرت کمر خدمت باندھ سامنے آ کھڑا ہوا۔ نقیب جریب اٹھائے سرو قد کھڑے ہیں۔ چیدہ چیدہ صاحب کمال پیش ہو رہے ہیں۔

ایک نوجوان۔ ماہ روز ہرہ جبین ستاروں سے کھیلتا ثور[۱] فلک پر سوار دربار میں آیا۔ عطارد[۲] قلمدان لئے جلو میں حاضر۔ نقیب نے آواز دی۔ مرزا عاشور بیگ تشریف لاتے ہیں۔ اپنے وقت کے بہترین منجم۔ انہوں نے برسوں پہلے حکم لگا دیا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں

---

[۱] ایک برج فلکی کا نام ہے۔ [۲] ایک ستارہ کو کہتے ہیں جسے دبیر فلک بھی کہا جاتا ہے۔

دہلی پر کوئی آفتِ آسمانی بلائے ناگہانی، آنی مقدر ہے۔ ۵۷ء
کا نام سن کر اہلِ محفل پر سناٹا چھا گیا۔ دِلی والا تا سرنگوں ہو بیٹھیں۔ زخم
جو ابھی بھرے نہ تھے پھر ہرے ہو گئے۔ انگور پھپٹ نکلے۔ چشمِ گریاں
نے دلِ شوریدہ پر نمک پاشی کی۔ یادِ رفتگاں نے تڑپا دیا۔ مرزا صاحب
موصوف میزان[1] میں ٹانکم ٹوک اترے، دربار میں جگہ پائی۔

میر کرامت علی خاں، شطرنج کے بادشاہ مہروں کی تھیلی ہاتھ میں
لئے۔ حلوہ سوہن کی ٹکیہ تیغے میں اڑسے چلے آ رہے ہیں۔ بھاٹ نے کہا
یار شاطر کرامت علی خاں تشریف لاتے ہیں، ان کی چال کرامت
سے کم نہیں۔ جو شاطر دہلی کا رُخ[2] کرتا ہے، پہلے ان سے بازی ہوتی
ہے۔ دو چار چالوں میں نرچ[3] ہو جاتا ہے۔ کشت[4] امید پر پانی پھر جاتا ہے
نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ یہ حاضر بھی کھیلتے ہیں غائب بھی۔ بساطِ[5] دربار پر جگہ ملی

اتنے میں دریا کی طرف سے کچھ آواز آئی۔ اہلِ دربار نے مڑ کر دیکھا
تو ایک شخص آستین چڑھائے۔ شرعی پاجامہ پہنے پاؤں اور ہاتھوں سے

---

[1] ایک برج کا نام ہے۔ [2] ایک مہرہ کا نام ہے۔ [3] ایک شکل کا نام ہے۔
[4] ایک اصطلاح ہے۔ [5] ایک اصطلاح ہے۔

پانی کاٹتا چلا آرہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے کنارہ آ لیا چشم زدن میں خشکی پر آ پہنچا
دریا میں سے آیا اور دامن ترنہ ہوا۔ لوگ تعجب سے دیکھتے تھے۔ نقیب
نے آواز دی میر ماہی تشریف لاتے ہیں۔ بھاٹ نے عرض کی، فنِ
پیراکی کے استاد بے بدل ہیں، دربار شاہی سے میر ماہی خطاب پایا
ہے۔ بہت استادوں سے پانی ہوئے پر اس قلزم فن نے سب
کے منہ پھیر دئے۔ دھارے پر چڑھتے ہیں۔ ہندوستان بھر کے
پیراک ان کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ ماہی و مگر کے زہرے ان سے آب
آب ہیں۔ بڑے بڑے استادان کے روبرو عرقِ ندامت میں غرق ہیں
ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے۔ یہ کون چار یار چلے آرہے ہیں۔ علم و ادب کے
آثار بشرہ سے نمودار۔ ذہانت ذکاوت، خوش مذاقی اور تدبر جلو میں حاضر
بھاٹ نے آواز دی۔ مولوی محمد شفیع خانصاحب۔ مولوی محمد تقی خاں
صاحب۔ مفتی صدرالدین صاحب صدرالصدور۔ عطاءاللہ خانصاحب
صدر امین۔ یہ چاروں بھی حضرت عبیداللہ علیہ الرحمۃ کی اولاد ہیں اور
ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار۔ مولوی محمد شفیع خاں صاحب۔ علم
منقول ہر دربار میں ان کی سفارش کرتا ہے ان کے حقیقی بھائی مولوی

محمد تقی خاں صاحب علم معقول میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ شہر میں ہزاروں ان کے شاگرد ہیں اور سینکڑوں خوشہ چین۔ مفتی صدر الدین صدر الصدور۔ اپنے وقت کے مفتی۔ عالم بے بدل یکتائے روزگار مدبّر۔ عطار اللہ خاں صاحب صدر امین ان کو خدائے لایزال نے اپنی بارگاہ کے علم و ادب کا خزانہ عطا کیا ہے۔

بھاٹ تو اتنا کہہ کر خموش ہو گیا۔ منجم قدرت اشارہ پا کر کھڑا ہوا اور یوں عرض پرداز۔ دلی سے باہر کچھ عورتیں اور بچے چلے جا رہے ہیں۔ بچے گدڑیوں میں لعل ہیں عورتیں آفت رسیدہ شرافت کی پتلیاں، چادروں میں بدن لپیٹے قدم قدم پر لڑکھڑاتی ہیں۔ خاندانی شرم وحیا قدم نہیں اٹھنے دیتی۔ مصیبت آگے دھکیلتی ہے، بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بڑوں نے پیٹ سے پتھر باندھ رکھے ہیں۔ پردہ نشین خواتین جن کا پلّو کبھی کسی نامحرم نے نہ دیکھا سر راہ بیٹھی بچوں کو دودھ پلا رہی ہیں مصیبتوں اور فاقوں نے دودھ سکھا دیا ہے۔ بچہ جھنجلا جھنجلا کر منھ مارتا ہے اور آنسو بھری آنکھوں سے مڑ مڑ ماں کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ فلک زدہ ماں آسمان کی طرف دیکھتی ہے۔ دودھ کہاں جو اترے، ہاں آنکھوں سے آنسوؤں کا

دریا بہ جاتا ہے، اس قافلہ کا میر قافلہ مولوی محمد شفیع خاں ہے۔ پوتڑوں کا رئیس، خاندانی نواب، معزالدولہ وزیر بہادر کا رشتہ دار۔ یہ اپنے علم و لیاقت کی بدولت سرکار انگریزی میں ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کا میر منشی ہوگیا تھا جب غدر پڑا اس کے چھوٹے بھائی مولوی محمد تقی نے کہا کہ بھائی صاحب اب شہر میں عزت اور جان کا خطرہ ہے، چلئے کہیں نکل چلیں۔ یہ اس زمانہ کے شریف انگریزوں کی آنکھیں دیکھے ہوا تھا۔ راضی نہ ہوا اور کہا کہ انگریز کبھی کسی کو بے قصور نہیں مارتے۔ نہ میں باغی ہوں نہ مجرم، پھر مجھے کیا ڈر۔ چھوٹا بھائی اپنے لواحقین کو لیکر چلا گیا اور یہ یہیں رہے، دوران غدر میں دروازہ پر سے ایک آہ کی آواز آئی، کچھ دھما کا سا سنائی دیا۔ یہ گھبرا کر باہر نکلے دیکھا تو نوجوان اکلوتا بیٹا خاک و خون میں لوٹ رہا ہے، کلیجہ دھک سے ہوگیا، دنیا آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔

اب آنکھیں کھلیں۔ بیجا اعتبار کا نتیجہ پا لیا۔ بڑھاپے کے سہارے کو سپرد خاک کر حرم محترم کو ساتھ لے پانی پت کی طرف روانہ ہوا، اب یہ حضرت قلندر صاحب کے آستانہ پر مع اہل و عیال پناہ لے گا، آفت رسیدوں کا اس وقت اگر کہیں ٹھکانہ ہے تو بزرگوں کے آستانوں،

فقیروں کے تکیوں اور غریبوں کے جھونپڑوں میں امیروں کے محل
لٹ رہے ہیں، رئیسوں کی ریاست پامال ہو رہی ہے۔ اس کا قریبی
رشتہ دار نواب عموجان ریاست الور میں برسر اقتدار ہے فلک زدہ
مفلوک الحال اہل تبار کا حال سن کر پیغام وسلام بھیجتا ہے۔ اور ایک
لٹھ بطور تحفہ۔ اس میں اشرفیاں بھری ہیں ؎ع۔ مردے از غیب بروں
آید و کارے بکند۔ کچھ روٹی ٹکرے کا سہارا ہو جاتا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی
مولوی محمد تقی حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ
پر بال بچوں کو لئے سر چھپائے پڑا ہے، ایک کی دوسرے کو خبر نہیں، زندہ
ہیں پر لاپتہ۔ مردے کو تین دن روتے ہیں اور پھر صبر کرکے بیٹھ جاتے ہیں
رونا تو ان کا ہے جو جیتے جی چھٹ گئے، جب تک سانس ہے اُس
وقت تک آس ہے۔ دونوں بھائی اس امید میں دست بدعا رہیں گے
کہ شاید کبھی ایک کو دوسرے کا منھ دیکھنا نصیب ہو۔ اس کے دربار میں
دیر ہے اندھیر نہیں۔ یہ بچھڑے پھر ملیں گے محمد شفیع کو بگوا صاحب کا
نعم البدل خدا دیگا۔ اس کے ہاں اولاد نرینہ ہوگی۔ اس کا نام چلے گا۔
اس کی بیل منڈھے چڑھے گی، یہ دونوں بھائی پھر خوش و خرم یکجا

ہو کر بیٹھیں گے۔

مفتی صدر الصدور کو دیکھ کر منجم قدرت یوں عرض پرداز ہوا کہ تدبر اور سیاست ان کو ہر محفل میں صدر نشین کرے گی، دوران غدر میں باغی جہاد کے فتوے پر دستخط لینے ان کے پاس جائیں گے۔ وہ عجب چہ کنم کا وقت ہوگا۔ دستخط کرتے ہیں تو باغی فرار پاتے ہیں۔ حکومت برطانیہ سے بگڑ جاتی ہے۔ اور اگر دستخط کرنے میں ذرا بھی لیت و لعل پاتے ہیں تو باغی سر قلم کرنے کو آمادہ تیغ و تفنگ لیے کھڑے ہیں غرض دو گونہ عذاب است، ان کی رفیق ازلی سیاست عملی آڑے آتی ہے بخندہ پیشانی دستخط کرتے ہیں۔ نیچے بالجبر لکھتے ہیں ذرا سے نقطے کے رد و بدل میں سارا معاملہ زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ باغی شاداں و فرحاں خوش و خرم فتوے لیکر اپنا راستہ لیتے ہیں۔ غدر کا فتنہ فرو ہوتا ہے۔ یہ باغیوں کی قطار میں عدالت سرکار میں اظہار دیتے ہیں، ان کا دستخطی فتوے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے دستخط پہچانتے ہیں اور عدالت سے صفائی میں عرض کرتے ہیں کہ یہ دستخط بطیب خاطر نہیں بلکہ بالجبر کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ نیچے تحریر کر دیا ہے۔ بریت ثابت ہوتی ہے۔ صاف

چھٹ جاتے ہیں۔ اہل دربار اس حسن تدبیر پر عش عش کرتے ہیں۔ اور ان چاروں کو بھی حسب مرتبت جگہ ملتی ہے۔

نقیب نے آواز دی بدرالدین خاں مہرکن تشریف لاتے ہیں نگین عالم پر ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہے۔ مہر دوام ان کے نام ہے۔ زیب دیتا ہے اگر ان کو کہا جائے کہ ع درکفت او موم است سنگ خارا۔ منجم قدرت نے عرض کی، سلاطین روزگار کی مہریں کھود گئے دولت میں کھیلیں گے۔ صاحب کمال تھے، دربار میں جگہ پائی۔

اسداللہ خاں غالب تشریف لاتے ہیں۔ مرزا نوشہ لقب۔ شاہِ سخنوری، شہنشاہ مملکتِ تخیل۔ صدر نشین بزم شعروسخن۔ اہل دربار نے تعظیم دی، صدر محفل جگہ خالی کی گئی۔

مرزا بیٹھے ہی تھے کہ نقیب نے آواز دی۔ منشی ہر گوپال تفتہ تشریف لاتے ہیں۔ مرزا آگے بڑھے اور کہا۔ کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ مرزا تفتہ۔ خوشامد نہیں کرتا۔ سچ کہتا ہوں کہ ان کے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ ؎

سوادِ ہند گرفتی بہ نظمِ خود تفتہ   بیا کہ نوبت شیراز و وقت تبریز است

یہ کہہ ہاتھ پکڑ صفِ شعرا میں لیجا بٹھایا

منشی بالمکند بے صبر جن کا اہل دربار بے صبری سے انتظار کر رہے تھے آئے اور مرزا تفتہ کے قریب ہو بیٹھے۔

نواب مصطفےٰ خان شیفتہ نہ صرف گلِ بے خار بلکہ گلشنِ بے خار[1] لئے تشریف لائے، ان کی تنقیدِ سخن سے حضرت غالب شیفتہ ہیں نو شتم غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں نقیب نے حضرت غالب کے پاس لے جا بٹھایا۔

استاد ذوق۔ ذوقِ سلیم، خاطرِ مو شگاف وطبع مشکل پسند لیکر آئے۔ بھاٹ نے کہا، استادِ شہ تشریف لاتے ہیں۔ اہل دربار نے تعظیم دی۔ صدر محفل جگہ ملی۔

محمد حسین آزاد، طبع آزاد لئے، نیرنگِ خیال[2] سے کھیلتے، آبِ حیات[3] بہاتے تشریف لائے، استاد ذوق کے پاس جگہ پائی

یہ کون جوان ہے! سرخ وسپید رنگ، نازک اندام، سیاہ پتلی

---

[1] تذکرہ گلشن بے خار ان کی تصنیف ہے۔ [2] ان کی مشہور تصنیف ہے [3] ان کی تصنیف ہے۔

کالے بال، غب غب سیمیں، ماتھے پہ قشقہ۔ ہاتھ میں ستار۔ بھاٹ زمزمہ[1] سنج ہوا کہ بلبل بوستان کشمیر۔ طوطیٔ رنگین صفیر۔ مہر کامل بدر منیر سندر صورت موہنی مورت۔ سرمنڈر[2] کے پجاری پنڈت ہردے ناتھ ہیں مرزا چڑیا اور مرزا کالے کے پاس جگہ پائی۔

قلم سر جھکائے تحریر غلامی لئے آگے آگئے۔ خطاطی خط بندگی لئے جلو میں حاضر۔ محمد امیر عرف میر پنجہ کش۔ نوک و پلک سے درست نہایت نستعلیق[3] ادا سے چلے آرہے ہیں۔ بھاٹ نے عرض کی یکتائے زمانہ خوشخط اور بہترین پنجہ کش۔ ان کے الف میں قدِ جاناں کا لطف ہے اور عین حور عین پر چشمک زنی کرتی ہے۔ ایک حرف ایک روپے میں بکتا ہے۔ شام کے وقت کمرہ پر ہو بیٹھتے ہیں۔ اور محتاج، ضرورت مند۔ غریب غربا ایک ایک حرف لے جاتے ہیں اور چوک پر بیچ لیتے ہیں۔ منجم نے دفتر مستقبل کھولا اور کہا۔ انجام کار حرم محترم کی حفاظت کرتے ہوئے یہ پنجہ کش پنجۂ اجل کا شکار ہوگا۔ مرزا اشارہ پاکر عرض کی۔ ان کے دروازہ پر کچھ گورے آتے ہیں۔ گھر کے اندر گھسنا چاہتے

---

[1] موسیقی کی ایک اصطلاح [2] موسیقی کی ایک اصطلاح [3] خطاط کی اصطلاح ہے۔

ہیں۔ یہ باہر آتے ہیں تلوار چلاتے ہیں۔ ہر ایک کی دوا دو، دو کی دوا چار، دو چار کو تلوار کے گھاٹ اتار ایک گولی کا شکار ہو جاتے ہیں،

نقیب نے آواز دی ، ماسٹر رام چندر تشریف لاتے ہیں علم ریاضی کے استادِ بے بدل منشی ذکا ءاللہ کے استاد۔ ہندسہ کی او اپکھ ایسی دل کو بھائی ، شکل عروسی[1] نے وہ عروسانہ چھب دکھائی کہ تثلیث کے ہو لئے۔ علماء کی صف میں مرتبۂ اعلیٰ پر بٹھائے گئے۔

اتنے میں فریدالدین خاں صاحب تشریف لائے بھاٹ نے عرض کی۔ علم ریاضی میں فرد فرید ہیں۔ ماسٹر صاحب کے قریب جگہ پائی۔ ان کے پیچھے پیچھے قطب الدین صاحب تشریف لائے۔ یہ ہندسہ کے قطب الاقطاب ہیں۔ اسی صف میں جگہ پائی۔

تفضل حسین خاں حسن و جمال کی تصویریں لئے۔ قہر و جلال کے مرقعے اٹھائے ، مردوں کو بیک جنبش قلم زندہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ بھاٹ نے عرض کی ، ان کے ہاتھ کی تصویر منھ سے بولتی ہے خط و خالِ معشوق سا نظر فریب ۔ نکتہ میں نکتہ پنہاں۔ ان کی رنگ آمیزی

---

[1] اقلیدس کی ایک شکل کا نام ہے۔

سے پیکرِ تصویر دل میں جگہ پاتا ہے، جمالِ مصنوعی حسنِ حقیقی پر فوقیت لے جاتا ہے۔ اس صاحب کمال کے روبرو مانیؔ و بہزادؔ کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے، رنگ نہیں جمتا۔ چہرہ اترا جاتا ہے۔ منجم نے عرض کی نگارخانۂ روزگار میں اپنی یادگار بے شمار مرقعے چھوڑ جائیں گے

ایک شہسوار ابرش[1] بخدی[2] پر سوار تومڑ توڑ[3] لنگوری[4] اڑاتا چلا آتا ہے۔ گھوڑے نے قرقری[5] کر رکھی ہے۔ بھاٹ نے کہا استاد فجو بیگ تشریف لاتے ہیں۔ یہ وہی فجو بیگ ہیں جنہوں نے لال ڈگی کے سانڈھ کو سدھ کیا تھا۔ ولی ماتا نے کہا اچھا یہ وہی فجو بیگ ہیں لال ڈگی کا واقعہ بیان کرو۔ بھاٹ نے عرض کی حضور لال ڈگی پر ایک سانڈھ تھا اور آتے جاتے سواروں کو تنگ کرتا تھا، اکثر گھوڑے مار ڈالے سوار زخمی کئے، ایسا ویسا ادھر جاتے ہوئے کنیاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ استاد پر بھی حملہ کیا۔ یہ انٹر مانچ کر نکل گئے۔ زخم خوردہ

---

[1] گھوڑے کا ایک رنگ ہے۔ [2] عرب نسل میں بہترین گھوڑے بخد کے ہوتے ہیں [3] متواتر۔ [4] ایک چال کا نام ہے۔ [5] عرب گھوڑا دُم اٹھا کر سوار کی گردن پر سایہ کرتا ہے۔ اس کو قرقری کرنا کہتے ہیں۔

ان کو پہچان گیا۔ اور درپے آزار ہوا۔ ایک روز استاد پا پیادہ ادہر
سے چلے جارہے تھے کہ اس نے دیکھ پایا۔ اور اُن پر جھپٹا۔ یہ غپ
فیض بازار کی نہر میں کود گئے۔ اس نے سینگھ اڑا کر منڈیر کو ریلنا چاہا،
یہ موقع پا کر کمر پہ چڑھ بیٹھے، ایک ہاتھ بھر کا ڈنڈا ہاتھ میں تھا۔ اب جو
مارنا شروع کیا ہے تو اس کو چوکڑی بھلا دی۔ تیورا کر بھاگا، انہوں نے
ایک ہاتھ سے کوہان پکڑ لیا اور دوسرے سے ڈنڈوں کی بوچھاڑ
کردی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک یہ اس کی سرکوبی کرتے رہے۔ اس کا یہ
حال کہ بلبلاتا ہوا ادہر سے اُدہر۔ اُدھر سے اِدہر جاتا ہے۔ آخر کو
جب اُسے بالکل ہلکان لہولہان کردیا تو دلی دروازہ پر اُس پر سے
پھسل پڑے۔ اور اس نے پرانے قلعہ کا رخ کیا۔ اب اسی سانڈھ کا
یہ حال ہے کہ دور سے کسی ڈنڈے والے کو آتا دیکھتا ہے تو کان دبا
کر بھاگ جاتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن۔ اس نے کسی پر حملہ نہیں کیا۔
ولی ماتا نے پیٹھ ٹھونکی۔ چابک سواروں کی صف میں جگہ ملی۔
ممن صاحب قدعن[1] کے اشقر[2] گھوڑے پر سوار برغہ[3] چلاتے

---

[1] قدعن کا گھوڑا اتر کی نسل میں بہترین سمجھا جاتا ہے [2] ایک رنگ ہے۔ [3] ایک چال ہے۔

لا رہے ہیں۔ اُن کے پیچھے میاں جان شیام[1] کرن کا ٹھیاواڑی ٹٹو پر سوار ہائے سے پوئیہ[2] لا رہے ہیں۔ منجم نے کہا غریب الوطنی میں قتل ہوں گے مہاراج جودان سنگھ والیٔ الور۔ نواب تفضل حسین خاں صاحب کے پگڑی بدل بھائی بنیں گے۔ یہ دلی کے اکثر مفلوک الحال اہل کمال کو ریاست میں سفارش کرکے روٹی کے ٹکڑے سے لگا دیں گے۔ ممن صاحب اور میاں جان چابک سواروں میں جگہ پائیں گے۔ نیزہ بختی وہاں بھی ہم رکاب جائے گی۔ راجہ کے بھائی بھتیجے شورش کریں گے، اور یہ وطن سے دور مارے جائیں گے۔ استاد فجو بیگ کے پاس جگہ پائی۔

منشی نرائن داس صاحب پنواڑی تشریف لاتے ہیں۔ بھاٹ نے عرض کی۔ ع۔ برگ سبز است تحفۂ درویش۔ بلی ماروں میں پانوں کی دکان ہے۔ سہ نثر پڑھاتے ہیں۔ اس کتاب کے نکتے ان سے بہتر سمجھنے والا روئے زمین پر نہیں۔ شاگرد دکان پر جمع رہتے ہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری، پان بناتے جاتے ہیں علم کا دریا بہاتے جاتے ہیں۔ سرخ رو ہوئے۔ اہل علم میں جگہ پائی۔

---

[1] ایک رنگ ہے۔ [2] ایک چال ہے۔

اہل دربار مودب کھڑے ہو گئے۔ دلی ماتا نے تعظیم دی۔ یہ کون تین بھائی آ رہے ہیں کہ ملاء اعلیٰ طبقات نور لئے ساتھ ساتھ ہیں نقیب نے آواز دی مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مترجم کلام پاک مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر فتح العزیز کے مولّف مولانا شاہ رفیع الدین صاحب۔ بھاٹ نے عرض کی ع خاموشی در ثنائے تو حد ثنائے تست، رفعتِ علم تا لب فرش لینے آئی۔ صفِ علماء میں مرتبۂ بلند پر لے جا بٹھایا۔

مولوی میاں نذیر حسین صاحب اپنے معتقدین کے ہمراہ دفاتر احادیثِ مقدسہ لئے تشریف لائے، درجہ اعلیٰ پر بصد ادب بٹھائے گئے شاہ اسمٰعیل صاحب صراط المستقیم کی تلقین فرماتے تشریف لائے۔ اہل دربار نے تعظیم دی، دلی ماتا نے بنظرِ عنایت دیکھا۔ اور کہا سر پر نورِ شہادت پرتو فگن ہے، ان کا مستقبل بتاؤ۔ منجم قدرت نے دلی ماتا کی پیشین گوئی کی شہادت دی۔ اور کہا حکومتِ برطانیہ کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں گے اور سرحد کے قریب لڑتے ہوئے شہید

ان کی تصنیف ہے۔

ہوں گے۔ اہل دربار نے آنکھیں فرش راہ کردیں۔ اور ہاتھوں ہاتھ مرتبۂ ارفع و اعلیٰ پر لیجا بٹھایا۔

فلکِ فتنہ ساز، عیار، چالباز واقعاتِ عیاری سنکر چشمِ رشک سے روئے زمین کو دیکھ رہا ہے۔ توسنِ زبان کو میدانِ داستان[1] میں دوڑاتے میر کاظم علی داستان گو تشریف لاتے ہیں، طوطیٔ رنگین بیاں بلبل ہزار داستاں ہیں۔ مقراضِ زبان گل کترتی ہے بزم آراستہ کرتے ہیں تو بزم پر دیر کا رنگ پھیکا پڑجاتا ہے۔ رزم کا اہتمام کرتے ہیں تو کمانِ رستم[2] نقابِ سحابِ عنبریں نقاب منھ پر لیتی ہے۔ شیروں کے سپتے پانی ہو جاتے ہیں۔ ابھی ابھی دسترخوان جنا خوانِ فرعون کو بے نمک کردیا۔ محفل رنگ و بو آراستہ کی، صراحی و پیمانہ لا دہرا، ساقیٔ گل عذار کو لا کھڑا کیا، دنیا کو بن پیے متوالا بنا دیا۔ جادو کا ذکر چھیڑا۔ اللہ رے جادو بیانی سامعین کو دم کے دم میں مسخر کرلیا

---

[1] داستان کے ایک حصہ کو میدان کہتے ہیں [2] قوس و قزح۔

اور پھر لطف یہ کہ دل گھبرانے نہیں پاتا طبیعت اکتاتی نہیں۔ صاحب کمال تھے، اہل دربار میں داخل ہوئے۔

خسرو خاور، باختر، میں سربسجود آیا۔ زینت المساجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے اجازت چاہی ولی ماتانے دربار برخاست کیا اور چل کھڑی ہوئیں۔ مہر تاباں آغوش مغرب میں ہے۔ نیر جہاں افروز دیو سیاہ سے بغلگیر معشوقوں کی آمد آمد ہے۔ عشاق گوش برآواز بیٹھے ہیں۔ کمرہ کی چاندنی بدلوائی گئی کوئی ماہ رو آنے والا ہے۔ جام و مینا سجے ہیں کسی مخمور چشم کا خیر مقدم ہے معشوق گل اندام غنچہ دہن کے لئے پھولوں کی سیجیں سجی ہیں، مرقعہائے زنگارنگ سے کمرہ نگار خانہ چین بنا ہے۔ لعبت چینی کی آمد ہے، بوقلموں قندیلوں اور قمقموں سے گھر بقعۂ نور ہو رہا ہے۔ کسی دلبر رنگین ادا کے رخ روشن کی دید کا سامان ہے۔ ساقی سیم ساق و معشوق سیم غبغب کے واسطے چاندی کے ورق لگا کر بیڑے بنائے گئے ہیں۔ سرخ زردی کی تمنا ہے۔ شیشہ آلات کی آرایش سے گھر آئینہ خانہ بنا ہے۔ کسی آئینہ زانو کا انتظار ہے، ڈیوڑھی پر

ڈولی کی آہٹ ہوئی۔ صاحب خانہ خود لپکے۔ پردہ الٹ، ہاتھ پکڑ باہر نکالا کمرہ میں لا بٹھایا کہاروں کو انعام واکرام دے رخصت کیا۔ غنچۂ دل کھل گیا، مراد بر آئی۔ کہیں عین انتظار میں پیغام بر آیا کہا نہیں آسکتے۔ مجبوری ہے، دل مرجھا کر رہ گیا۔ کشتِ امید پر پانی پھر گیا۔

دلی ماتا جامع مسجد پہنچیں۔ شوقین مزاج انگرکھے کے بندوں میں چمپا کے پھول باندھے۔ چوگوشیا۔ دو پلڑی۔ دو باکی۔ مغلی ٹوپیاں اوڑھے اشہب، ادہم، مشکی۔ ابلق گھوڑوں پر سوار دو گامہ۔ سہ گامہ راہوار چلے جارہے ہیں ارباب نشاط رنگا رنگ پوشاکیں پہنے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بہلیوں کے تانگوں میں مشغولِ سیر ہیں۔ تانگوں کی چھم چھم دلِ عشاق کو گدگداتی ہے۔ سامنے سے بی داراں صاحبہ کی سواری گذری تیکھی چتون، بانکی ادا۔ اک نگہِ فتنہ ساز ڈالتی گذر گئیں۔ دلی ماتا نے پوچھا یہ کون تھیں۔ مصاحبین میں سے ایک نے عرض کی حضور ان کا دلدارہ نام ہے۔ عام طور پر بی داراں صاحب کے نام سے مشہور ہیں، کراماتؔ کی ان پر نظرِ کرم ہے۔ نارنول میں جاگیر ہے۔ شاہ جی کے چھتہ میں

لہ بہادر شاہ کو کہتے تھے۔

ذاتی مکان، یہاں جب آتی ہیں اسی میں ٹکتی ہیں، حافظہ قیامت کا پایا ہے، ایک مرتبہ شعر سن لینا شرط ہے۔ پھر کیا مجال جو بھول جائیں۔ جب فرمایش کیجئے حاضر ہے، اگلے بازی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، کرامات کا تمام کلام نوکِ زبان ہے۔

یہ سب خراماں باتیں کرتے شاہ جی کے چھتہ پر جا پہنچے دلی ماتا نے کہا آؤ ذرا بی داراں صاحب کے ہاں چلیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ ایک دفعہ کے زخم خوردہ تھے۔ کسی نے چوں تک نہ کی۔ چپ چاپ کان دبائے پیچھے ہولئے دروازہ پر دستک دی۔ نوکر آیا۔ اطلاع کروائی۔ بی داراں صاحبہ خود پیشوائی کو آئیں۔ سب کو ایک پُرتکلف کمرہ میں لے گئیں۔ جوگن جی کو صدر میں مسند پر بٹھایا۔ چھوکری سے پاندان منگوا اپنے ہاتھ سے پان لگا چاندی کے خاصدان میں پہلے دلی ماتا کو پیش کئے۔ چکنی الائچی لکھنؤ کا قوام۔ بنارس کا زردہ اہل محفل نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق گنگا جمنی تھالی میں سے لیا۔ گلوری منہ میں رکھتے ہی دماغ معطر ہو گیا، کتھے میں مشک و زعفران

کی آمیزش تھی۔ چھالیا گلاب میں بھیگی ہوئی، سچی سیپ پھونک کر چونا بنایا ہے۔ پان کچھ ایسا رچا کہ دُرِ دندان یاقوت مین اور لعل احمر کو مات کرنے لگے۔ اتنے میں ایک چھوکری عطردان لیکر آئی۔ اس میں موسم کے لحاظ سے عطر بھرے تھے۔ اہل محفل کو پیش کیا۔ کسی دُرِ دریائے لطافت نے موتیا کا عطر لگایا۔ کسی گل خوردہ نے گلاب بسایا۔ ایک نازک مزاج چھیل چھبیلے نے جوئی چنبیلی سے شوق کیا۔ دلی ماتا نے عطرِ گل ملا اور کہا ع خاک سے رغبت رہے جانا ہے آخر خاک میں۔

سب آرام سے گاؤتکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ پہلے تو کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر موسیقی کا ذکر چھڑ گیا۔ دلی ماتا نے بی داراں صاحبہ سے کہا۔

دلی ماتا۔ کیوں بی داراں صاحبہ تمہاری موسیقی کی بابت کیا رائے ہے۔

بی داراں۔ بھلا حضور میں آپ کے سامنے کیا رائے دے سکتی ہوں۔

دلی ماتا۔ نہیں بی داراں صاحبہ تم اس علم سے واقف ہو۔ تمہاری رائے ہزاروں لاکھوں میں قابلِ وقعت ہے۔

ی واراں ۔ پابندیٔ حکم کے طور پر اپنے ناقص خیال کا اظہار کیۓ دیتی ہوں،
سازِ وروں سے چھیڑ چھاڑ کا نام موسیقی ہے۔ یہ اظہارِ جذبات
کا ایک طریقہ ہے۔ مطرب اگر طرب زا نہیں تو مطرب نہیں
موسیقی یا اشک آور یا رقص آور۔ ورنہ موسیقی کہلانے کی مستحق
نہیں، خالی سُروں کا اتار چڑھاؤ ایک بے معنیٰ چیز ہے۔ نفسِ عا
جذبات کو متحرک کرنا ہے۔ ہر وہ شے جو جذباتِ انسانی سے
متعلق ہے۔ حدودِ قواعد کی متحمل نہیں ہو سکتی، اسی طرح موسیقی
ایک حد تک پابندِ قواعد ہو سکتی ہے۔ زیادہ نہیں۔ تال سُر کی
احتیاط نوآموزوں کے واسطے ضروری ہے ورنہ اصل موسیقی
ان سب سے بالاتر ہے۔ موسیقی کا مدار سُر پر ہے اور سُر بغیر رس
کے قالب بے روح۔ جذباتِ انسانی کو مدِنظر رکھ کر یہ رس قائم
کیۓ گئے ہیں مثلاً شانت رس۔ روحانی سکون پیدا کرتا ہے۔
اور اکثر عبادت سے متعلق چیزیں اسی رس سے بندھی ہیں،
دوسرا بیر رس۔ یہ جذبات تہور کو متحرک کرتا ہے اور رجز کی
قسم کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ بِروگ رس، اس میں آہ ہے

ورد بھرا ہے۔ چوتھے شرنگار رس۔ یہ حیوانی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے
علاوہ ازیں اکثر رس ایسے ہیں جو موسیقی میں عیب گنے جاتے ہیں
مثلاً غصہ۔ مشرقی موسیقی کی بنیاد عبادت پر ہے۔ اور وہاں اس
جذبہ کی گنجائش نہیں۔ فی زمانہ اکثر گانے والے بعینہ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ سُروں سے سر پھٹول کر رہے ہیں۔ یہ چیز خارج
از موسیقی ہے۔

تال کو زیادہ اہمیت دینا بھی غلطی ہے۔ راگ کو ایک شعر سمجھ لیجئے
کہ سُر اس کے الفاظ ہیں۔ رس معنی۔ اور تال وزن۔ راگ سے
رس کو علیحدہ کر دیجئے تو اس کی حقیقت ایک مہمل شعر سے زیادہ
نہیں رہتی کہ الفاظ موجود ہیں۔ وزن صحیح ہے لیکن معنی ندارد
بس جو رتبہ ایک بے معنی شعر کا ہے وہ ہی بے رس راگ کا، وزن
ایک حد تک ضروری ہے پر اس کو معنی پر فوقیت نہیں دیجا سکتی
اسی طرح تال لازمی ہے مگر اس کو رس پر تفوق نہیں

بی داراں۔ یہ کہکر خموش ہوگئیں اور دلی ماتا نے بھی ان کی رائے
پر مہر تصدیق لگائی اور کہا۔

دلی ماتا۔ بے شک راگ کی روحِ رواں رس ہے، اگر وہ نہیں تو راگ ایک جسدِ بے جان ہے، اچھا بی داراں یہ تو بتاؤ کہ طوائفوں کا پیشہ شروع کب سے ہوا۔

بی واراں۔ حضور بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ اکثر لوگ اپنی لڑکیوں کو پُن کر کے مندروں میں بھیجد یتے تھے، اُن کو وہاں باقاعدہ گانے اور ناچنے کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ رقص و سرود سے دیوتاؤں کا دل بہلائیں اور عبادت میں حصہ لے سکیں ان میں سے اکثر تو اپنے ایمان پر قائم رہتی تھیں۔ اور تمام عمر مندروں کی خدمت میں گذار دیتی تھیں اور بعض آخر انسان تھیں دنیاداری کی طرف مائل ہو جاتیں۔ ایسیوں کو مندر سے مردود کر کے نکال دیا جاتا تھا۔ ان کا نہ کوئی سر دھرا ہوتا تھا نہ گھر نہ در، چونکہ دیوتاؤں کے نام کی ہوتی تھیں۔ اس لیئے کوئی بیوی بنانے کی بھی ہمت نہ کرتا تھا اور نہ سماج ہی اجازت دیتا تھا۔ حضور پیٹ سب کے ساتھ لگا ہوا ہے اس دوزخ کو بھرنا ہی پڑتا ہے۔ جب یہ بدنصیب لڑکیاں تمام دروازہ بند پاتی تھیں تو مجبور و لاچار

اس فن کو جو مندر میں دیوتاؤں کی دلبستگی کے واسطے سیکھا تھا
انسانوں کی تفریح طبع کے لئے استعمال کرنے لگتی تھیں ،
جب عمر ڈھل جاتی تو اور جھٹکی ہوئی لڑکیوں کو اپنا آلہ کار بنا
لیتیں ۔ اور خود نائکہ بن جاتی تھیں ۔ نائکہ اب برے معنی میں
استعمال ہونے لگا ہے ، ورنہ اصل میں یہ نائک کی مؤنث
ہے ۔ اور چونکہ یہ عورتیں موسیقی کی ماہر ہوتی تھیں ۔ اس وجہ
سے نائکہ کہلاتی تھیں ۔ سو حضور اس طرح یہ سلسلہ شروع
ہوا جو آج تک چلا آتا ہے ، رفتہ رفتہ ہمارے گھر امیروں ،
رئیسوں کی تفریح گاہ بن گئے ۔ دنیا میں جس طرح شکلیں مختلف
ہیں اسی طرح طبیعتیں بھی سب نے الگ الگ پائی ہیں ، کوئی
موسیقی کا شوقین آتا ہے ۔ کوئی حسن پرست اور کوئی بوالہوس
ہمارا کام ٹھیرا کہ ہر طرح سے آپ کی تفریح کا سامان کریں ، آپ
کو معلوم ہی ہے کہ ڈیرہ دار طوائفیں یا کسی رئیس کی پابند ہوتی
ہیں یا آپس میں نکاح ہو جاتے ہیں ۔ پھر یہ تدبیر کی گئی کہ چھوکریاں
خریدی جائیں جو امرا کی ہر طرح خدمت کریں ۔ اور ان کی طبیعت

یہاں سے اچٹنے نہ پائے ،

دلی ماتا۔ یہاں ایسی کون سی کشش ہے جو مردوں کو کھینچے لئے چلی آتی ہے ، ان کو یہاں کیا ملتا ہے جس سے وہ گھر میں تشنہ رہتے ہیں ، اور جس کی تلاش میں در در پھرتے ہیں ،

بی داراں۔ حضور انسان فطرتاً متلون مزاج ہے۔ علاوہ ازیں یہاں ان کو وہ چیز ملتی ہے جو گھر میں مل ہی نہیں سکتی۔

دلی ماتا۔ یہ ہی تو ہم سمجھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسی کون سی شے ہے۔ جو یہاں موجود ہے۔ اور گھر میں مفقود۔

بی داراں۔ حضور گھر کی عفت مآب بیوی میں اور ایک طوائف میں بہت بڑا فرق ہے۔

دلی ماتا۔ وہ فرق کیا ہے

بی داراں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔

دلی ماتا۔ بی داراں ہماری خاطر سے۔ دیکھو ہم آج آئے ہی اس نیت سے ہیں کہ یہ سب باتیں تم سے سمجھ کر جائیں۔ اگر ہماری خاطر منظور ہے تو بتا دو۔

بی وارا۔ بہت اچھا حضور۔ جو حکم الامر فوق الادب، آپ کا خیال ہے
کہ عورتیں عورتیں سب برابر۔ طوائفوں میں ایسے کیا لعل لگے
ہیں کہ مرد گھر کا آرام چھوڑ کر ان کے ہاں جاتے ہیں، پیسہ
خرچ کرتے ہیں، بدنامی مول لیتے ہیں۔ حضور دنیا کا بیوقوف
سے بیوقوف انسان بھی بلا وجہ ایک کوڑی خرچ نہیں کرتا
کچھ نہ کچھ لیتا ہے۔ جب جیب سے پیسہ دیتا ہے، یہاں جو
رئیس آکر لاکھوں اٹھاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ایسی لذت پاتے
ہیں جس کی تلاش میں واعظوں کے وعظ، ماں باپ کی تنبیہ
ہم نشینوں میں بدنامی کے باوجود کھچے چلے آتے ہیں۔ حضور گھر
کی بیوی اور طوائف میں وہ ہی فرق ہے جو شربت کے پیالہ اور
شراب کے گلاس میں ہے۔ بیوی شربت کا پیالہ ہے اور طوائف
جام مے۔ بیوی سے پیاس بجھتی ہے تفریح نہیں ہوتی۔ طوائف
سے پیاس بھی بجھتی ہے تفریح بھی ہوتی ہے اور ساتھ کے ساتھ
نشہ بھی۔ یہ سمّ قاتل ہے۔ مگر نہایت خوش گوار۔ اب اس کو خواہ
مدار عیش و نشاط سمجھئے یا وجہ ممات۔ یہ نشہ ہے جو مردوں کو

کشاں کشاں ہمارے در پر لاتا ہے۔ طوائف آپ کو وارفتہ وبیخود
کردیتی ہے۔ آپ اپنی حقیقت کو بھول جاتے ہیں، وہ آپ
کی ہستی کو ایک عرصہ کے لئے اپنے میں مدغم کرلیتی ہے۔ کوئی
غم آپ کے پاس آنے نہیں پاتا، آپ دنیا وما فیہا سے قطعاً
بے تعلق ہوجاتے ہیں۔ ایک طوائف کے پاس آپ لذتِ فنا
سے آشنا ہوتے ہیں، گھر میں آپ کی ہستی بدرجہ اتم موجود
ہوتی ہے۔ یہاں آپ کی خودی بےخودی سے بدل جاتی
ہے۔ ہم آپ کو اپنا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کی ہورہتی ہیں
اس لئے آپ ان کی قدر نہیں کرتے، آپ کی طبیعت ان سے
چھک جاتی ہے۔ اور وہ دیویاں گھر کی مرغی دال برابر ہوکر
رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنے کو مکمل طور پر آپ کے حوالہ کردیتی ہیں،
ہم آپ کو ترساتے ہیں، اس وجہ سے آپ ہمارے در پے
ہوتے ہیں اور ان سے دل برداشتہ ہوجاتے ہیں، وہ
آپ کی آسایش کی فکر میں رہتی ہیں۔ ہم آپ کے لئے سامان
عیش مہیا کرتے ہیں، ان کو جو کچھ فطرت نے سکھا دیا۔ وہی

جانتی ہیں ہم اس کو فن کی حیثیت سے حاصل کرتے ہیں، وہ خودروپھول ہیں۔ ہم کو عیش ونشاط کے پانی سے سینچا گیا ہے یہ فرق ہے گھر کی بیوی اور طوائف میں اور یہی چیز ہے جس کے مرد گرویدہ ہیں۔ علاوہ ازیں مرد کی خصوصیت ہے کہ جو چیز اسے بلا مشقت مل جائے اس کی قدر نہیں کرتا اور جسے محنت سے حاصل کرے یا طاقت سے شکار، اسے فخریہ دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ مثلاً آپ ایک مرغ بازار سے خرید لاتے ہیں۔ اس پر کوئی ناز نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اپنا شکار کردہ باعث فخر و نازش ہوتا ہے۔ فی زمانہ بیویاں آپ لوگوں کو بغیر کسی دقت کے مل جاتی ہیں، ماں باپ نے بات چیت کی سارا انتظام کیا، آپ عین دن کے دن دولھا بن کر چلے گئے، قاضی نے خطبہ پڑھا، آپ نے ایجاب وقبول کیا لیجئے صاحب، ہلدی لگی نہ پھٹکری بیوی مل گئی۔ اس وجہ سے آپ ان کی قدر نہیں کرتے، ہمارے دس گاہک ہوتے ہیں، اُن سے آپ کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے، ہماری مملکت دل کی تسخیر کے لئے آپ کو تمام

ذرائع استعمال کرنے ہوتے ہیں اور جب ہم قابو میں آجاتے ہیں تو آپ کے دل پر ایک جذبۂ فتح کارفرما ہوتا ہے اور ہم پر ناز کرتے ہیں۔

دلی ماتا۔ بی داراں صاحب بات تو یہ ہی ہے۔ جو چیز بلا محنت مل جائے انسان اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور مرد کی یہ خصوصیت ہے کہ محنت سے حاصل کرنے کے بعد بھی جب پوری طرح قابو پا جاتا ہے تو حد سے زیادہ بے اعتنائی برتتا ہے جس طرح چڑی مار جب تک چڑیا کو پھانس نہیں لیتا جال پھیلائے دانہ ڈالے بیٹھا رہتا ہے اور ہزار قسم کے لاسے دیتا ہے۔ چڑیا پھنسی اور گردن پکڑ تھیلے میں ڈال۔ پھر دانہ پانی کی بھی خبر نہیں لیتا۔ مرد مدارات اسی وقت تک کرتا ہے جب تک قابو نہیں پاتا۔ لبعد میں بات بھی نہیں پوچھتا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک مصاحب نے عرض کی کہ امیر مینائی لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں۔ اور آج نواب احمد سعید خاں صاحب کے ہاں محفل شعر و سخن آراستہ ہوگی یہ بات سن جوگن جی اٹھ کھڑی ہوئیں، بی داراں صاحبہ دروازہ

تک چھوڑنے آئیں اور یہ سب شاہ بھولا کے بڑ سے ہوتے ہوئے
قاسم جان کی گلی کی طرف روانہ ہوئے،

امیر مینائی اس محفل سے آئے تھے۔ جہاں بادۂ عیش ونشاط
کا دور چل رہا تھا۔ ہر طرف سے قلقلِ مینا اور بادہ مستوں کے قہقہوں
کی آوازیں آرہی تھیں۔ اہلِ طرب وقفِ طرب تھے،

یہاں کی محفل اجڑ چکی تھی جام ومینا چکنا چور ہو گئے تھے۔ اس
میکدہ کے مے آشام تشنہ کام ٹھکانے لگ چکے تھے،

یہ اس باغ کے بلبل تھے جہاں دورِ گل کا دور دورہ تھا۔ بادِ
بہاری چل رہی تھی۔ یہاں کا چمن لٹ چکا تھا۔ بادِ تند نے بڑے
بڑے تناور درخت جڑ سے اکھیڑ پھینکے تھے۔ تختۂ گل بیڑہ ہو گیا تھا
بلبل بے بال و پر نالہ کناں صحنِ چمن چھوڑ چکے تھے۔

بہرصورت امیر مینائی آئے تھے۔ خاطر لازمی تھی۔ دیوسیہ مست
کی دست برد سے جو بھی ٹوٹے پھوٹے ساغر بچے تھے ان کو اکھٹا کر بزم
سخن کی طرح ڈالدی۔

جوگن جی مع اپنے چیلوں کے نواب احمد سعید خاں صاحب کے

دولت کدہ پر پہنچیں۔ مغربی وضع قطع کا مکان ہے۔ کوٹھی کہلاتا ہے۔
اہل فرنگ ہندوستان میں تجارت کی حیثیت سے آئے تھے۔ یہاں پر
مہاجنوں تاجروں اور سیٹھ ساہوکاروں کے مکان جہاں تجارت کا
سلسلہ ہو کوٹھی کہلاتے تھے، بنابریں فرنگیوں کے مکان بھی کوٹھی
کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ ہر مغربی وضع کا مکان کوٹھی کے نام سے نام
زد ہو گیا۔

نواب احمد سعید خاں صاحب جگن جی کو دروازہ تک لینے
آئے اور ایک کمرہ میں مرصع مسند پر لے جا بٹھایا۔ جو رنگا رنگ قالینوں
سے زمین شعر بنا تھا، چپہ چپہ پہ روشنی۔ سارا گھر تخیل شاعر کی طرح روشن،
یہ سب بیٹھے ہی تھے کہ نوکر نے اطلاع کی، مولانا حالی تشریف
لاتے ہیں، نواب صاحب نے تا لب فرش استقبال کیا۔ ان کی
وضع مولویانہ سی تھی۔ سر پر کشمیری کام کی گول ٹوپی جمی ہوئی، ڈھیلی
ڈھالی اچکن۔ لٹھے کا معمولی موری کا پاجامہ۔ گرگابی جوتی چھچا نکلا ہوا۔
متوسط قد و قامت۔ چہرہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ۔ سانولا رنگ،
گول گول چمک دار آنکھیں۔ سب سے دعا سلام کے بعد خموش ہو بیٹھے

اتنے میں نواب کرم اللہ خاں صاحب المتخلص بہ شیدا۔ اوران کے چھوٹے بھائی نواب عبدالرحیم خاں صاحب بیدل تشریف لائے اہل محفل نے تعظیم دی۔ مولانا حالی نے ہاتھ پکڑا اپنے پاس بٹھالیا اور نواب احمد سعید خاں صاحب سے کہا ان صورتوں کے مارے دلّی میں پڑا ہوں ورنہ اب یہاں دل نہیں لگتا، اور یہ بھی چار دن کی چاندنی ہے میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔

بخت ہم داستانیٔ شیدا تونے آخر کو نارسائی کی

میاں بیخود تم کہاں چھپے بیٹھے ہو سامنے آؤ۔ ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا جو حضرتِ شیدا اور بیدل کے ساتھ آیا تھا اور سکڑا سکڑایا ان بزرگوں کی آڑ میں بیٹھا تھا۔ مولانا کے اصرار پر ذرا آگے سرکا اور دوزانو آنکھیں نیچی کر ہو بیٹھا۔ مولانا حالی نے پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور کہا طالب صاحب یہ بیخودِ صہبائے شاعری ہے۔ ہم تو چراغِ سحری ہیں، آئندہ یہ لڑکا چشم و چراغ سخنوری ہوگا، اس کی روشن خیالی بزم سخن کو جگمگا دے گی۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات، ابھی سے کلام میں وہ آب و تاب ہے کہ باید و شاید۔ ع

مشک آں باشد کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید، اب آپ خود سُن لیجے گا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میر مہدی مجروح آن پہنچے۔ یہ مجروح ناوکِ حسن وعشق ہیں۔ قسّامِ ازل سے دلِ شوریدہ اور طبعِ مجروح لیکر آئے ہیں۔ گورے چٹّے آدمی چھوٹا قد بھاری بدن منھ پر بکثرت چیچک کے داغ۔ آنکھیں کچھ بدرونق سی۔ اہلِ محفل کھڑے ہو گئے۔ نواب صاحب نے حضرتِ بیدار کے پاس بٹھایا۔ شہنشاہِ مملکتِ سخنوری صدر نشینِ بزمِ شعر وسخن، مسلم الثبوت استاد حضرتِ داغ تشریف لاتے ہیں۔ لمبا قد۔ دوہرا بدن۔ کالا رنگ، چڑھی ہوئی ڈاڑھی بھرا ہوا چہرہ۔ کھڑا نقشہ۔ آنکھ میں شوخی۔ سر پر چوگوشیا مخملی ٹوپی۔ مولانا حالی کے سامنے ہو بیٹھے۔

پیرِ مغانِ سخنوری سرشارِ مینائے شاعری امیر مینائی تشریف لائے۔ اہلِ محفل نے ہاتھوں ہاتھ لیا صاحب خانہ نے صدر میں مسند نشین کیا۔

حقہ اور پان کا دور چل رہا ہے۔ خدام با ادب عطر پیش کر رہے ہیں۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد شعر وسخن کا سلسلہ شروع ہوا ہر ایک

پہلے پڑھنے پر اصرار کر رہا ہے۔

حضرت داغ جیب سے غزل نکال ہو بیٹھے، اور میر مہدی سے کہا اجازت ہے۔ انہوں نے کہا ذرا تو توقف کیجئے ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کیا کہیں جانا ہے۔ اس آخری جملہ پر ذرا زور دیا۔ اور قدرے مسکرائے بھی۔ حضرتِ داغ نے دست بستہ عرض کی حضور! اب تو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس آجاتا ہے میں کہاں جاؤں گا۔

مولانا حالی نے پڑہ بینی پر عینک لگائی۔

حضرت شیدا اور بیدل نے بھی اپنی اپنی غزل سامنے رکھ لی میاں بیخود موقع پا پھر سمٹا سمٹا پیچھے ہو بیٹھے۔ آخر کار یہ قرار پایا کہ صاحب خانہ جس سے چاہیں پڑھوائیں۔ اب نواب صاحب سخت تچہ کنم میں تھے۔ کس کی بات ٹالیں کس کا حکم مانیں۔ مولانا حالی یہ کیفیت دیکھ کر بولے۔ حضرات ہم تو آفتاب سر کوہ ہیں۔ شگون نیک کے واسطے آج تو شاعر مستقبل میاں وحید الدین بیخود سے شروع کرایا جائے۔ یہ کہہ کر ادھر ادھر نظر ڈالی۔ پر حضرت بیخود کہیں نظر نہ پڑے،

پھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ وہ شیدآ اور بیدل کے پیچھے دبکے بیٹھے تھے،
حالی صاحب نے آگے بلایا اور کہا صاحبان یہ نواب کرم اللہ خاں
صاحب شیدا کے بھانجے ہیں۔ اس عمر میں بڑے پائے کا شعر
کہتے ہیں۔ اب آپ سن لیجئے گا۔ یہ کہہ بنجو صاحب کو غزل پڑھنے
کا حکم دیا۔ یہ شرمائے آنکھیں جھکائے بیٹھے ہیں۔ آہستہ سے
غزل جیب سے نکال سامنے رکھی اور تحت اللفظ نہایت خوش
ادائیگی سے پڑھنی شروع کی۔

زندگی سے مجھے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

مطلع پر داغ صاحب نے زبان کی داد دی اور کہا کیوں
نہیں آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ میاں بنجو اُٹھ کر آداب بجالائے
اور دوسرا مطلع پیش کیا۔

جاں نثاروں پہ قیامت کبھی ایسی تو نہ تھی
بے مروت تری عادت کبھی ایسی تو نہ تھی
تیرے ہی ظلم سے سب کچھ ہے گوارا ورنہ

غم کی جانب مجھے رغبت کبھی ایسی تو نہ تھی

سچ ہے میں نے ہی تو بدنام کیا ہے تجھکو

مجھ سے پہلے تری شہرت کبھی ایسی تو نہ تھی

اس شعر پر حضرتِ داغ اچھل پڑے اور کہا، واہ کیا چوٹ کی ہے۔ امیر مینائی نے بھی جزاک اللہ کہا مولانا حالی بولے :

داغ صاحب یہ جناب کا رنگ ہے۔

آج کچھ حال دگرگوں ہے خدا خیر کرے

تیرے بیمار کو غفلت کبھی ایسی تو نہ تھی

ذبح ہوتے ترے ہاتھوں سے کسے دیکھا ہے

جانِ مشتاقِ شہادت کبھی ایسی تو نہ تھی

میر مہدی نے کہا خدا تم کو چشمِ زخمِ حوادث سے بچائے

اس میں بہت سے پہلو پنہاں ہیں۔ زندہ باد

صبح عشرت کبھی آتی نہ ہو پیچھے پیچھے

مہرباں شامِ مصیبت کبھی ایسی تو نہ تھی

حضرتِ داغ نے کہا، لیجیے مولانا مبارک ہو اس جوان نے

میرے ہی رنگ پر چھاپا نہیں مارا ہے جناب کا بھی طرزِ ادا لے اڑا ہے۔ یہ لفظ مہرباں ملاحظہ ہوئے ہے نہیں آپ کا طرز؟

تم پہ مرکر ہوئی مرنے کی تمنا ہم کو
خواہشِ گوشۂ تربت کبھی ایسی تو نہ تھی

سچ بتا کس نے دکھادی اسے صورت میری
تیری تصویر کو حیرت کبھی ایسی تو نہ تھی

امیر مینائی نے اس شعر کی داد دی اور کہا ماشاء اللہ کیا بلند پروازی ہے۔

کیا کرے گا ستم ایجاد کوئی تازہ ستم
اب جو ہے مجھ پہ عنایت کبھی ایسی تو نہ تھی

داغ صاحب نے کہا یک نہ شد دو شد۔ یہ لیجئے مولانا یہ لفظ عنایت بھی جناب ہی پر عنایت ہے واہ میاں جلتے رہو

کس کی الفت میں ہے یہ حال تمہارا بیخود
بے قراری تمہیں حضرت کبھی ایسی تو نہ تھی[1]

مقطع پوری طرح ختم نہ ہونے پایا تھا کہ مولانا حالی نے اپنی

(۱؎ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

غزل شروع کردی۔ سب منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیرِ صفِ مژگاں کے نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلعتِ مگر وہ ہے برقع میں نہاں
کسی دلّالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملتے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رمنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

حاشیہ صفحہ ۱۳۳

ملہ یہ غزل مطبوعہ نہیں ہے حضرت وحیدالدین بیخود صاحب کا ایک مکمل دیوان بارہ سال سے بیس سال کی عمر تک کا غیر مطبوعہ موجود ہے۔ یہ اس میں سے پڑھی تھی۔

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدر شناس
قدر یہاں رہ کے اب اپنی نہ گنوا نا ہرگز

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موج زن دل میں ہیں یہاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یہاں گوہر یکتا تہِ خاک

دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رُلایا تو رُلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
آخری دور میں بھی تجھکو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز
بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

نواب کرم الہ خانصاحب سیطا

یہاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یہاں تیرا ٹھکانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دِلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کرکے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کردیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یہاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر

اب نہ دیکھوگے کبھی لطف شبانہ ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یہاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

مولانا غزل پڑھ ایک طرف ہو بیٹھے، یاد رفتگاں نے اہل محفل کو تڑپا دیا۔ کوئی دل تھامے بیٹھا تھا، کوئی منہ پھیر کر آنسو پوچھتا تھا، ہر طرف ایک سناٹا تھا۔ سب سرنگوں، مجروح نے سر اٹھایا اور کہا ظالم زخم ہرے کردئے

مولانا کے بعد حضرت بیدل کچھ پڑھنے کو تھے کہ شیدا نے روکا اور خود غزل شروع کردی۔

رحم مجھ پر ذرا نہیں کرتے — کچھ وہ خوف خدا نہیں کرتے
رکھیں احباب یہ وصیت یاد — حسن والے وفا نہیں کرتے
سارے اقرار ان کے جھوٹے ہیں — کرنے والے کہا نہیں کرتے
التفات ان کا بس قیامت ہے — یہاں کے ڈوبے ترا نہیں کرتے
جس کا جی چاہے ان کا ہو جائے — یہ کسی کے ہوا نہیں کرتے
مفت شیدا کو کردیا بدنام — لوگ دنیا میں کیا نہیں کرتے

نواب عبدالرحیم خانصاحب ایدل

مولانا نے کہا، مینائی صاحب حضرت شیدا کی زبان کا میں شیدا ہوں، الفاظ نہیں کہ ان سہل الممتنع اشعار کی تعریف کر سکوں ہاں انہی کے الفاظ میں ان کی تعریف ہو سکتی ہے۔

کیا پیاری زبان ہے شیدا   یہ تو اللہ کی قسم تم ہو

حضرت بیدل تیار ہی بیٹھے تھے غزل ختم ہوتے ہی انہوں نے شروع کر دی

زہے نصیب وہ آیا ہے دلبری کے لئے
اسی کے واسطے دل جان بھی اسی کے لئے

اب اس میں صوفیٔ صافی ہو یا کہ واعظ شہر
ہمیں تو چاہیئے ایک شخص دل لگی کے لئے

نہیں ہے منھ کا نوالہ کچھ آدمی بننا
بہت صفات ہیں درکار آدمی کے لئے

ہر اک ادا ہے دل آویز و دلربا اُس کی
ہزار دل بھی ہوں تو کم ہیں عاشقی کے لئے

بچا کے بادہ پرستوں سے ہم نے تھوڑی سی

لگا رکھی ہے فقط دورِ آخری کے لئے

اس شعر پر مولانا حالی نے کہا، ہائے بیدل اب تو وہ بھی نہ رہی
میخانہ کا میخانہ ویران ہوگیا۔ نہ بادہ مست رہے نہ بادہ پرست ۔
دنیا بدل گئی۔

عبث ہے شکوۂ گردوں کہ اس کا لطف وکرم
کبھی کسی کے لئے ہے کبھی کسی کے لئے

اس شعر کی بہت داد دی۔ مولانا اچھل پڑے اور کہا سچ ہے۔
تلک الایّام نداولہا بین النّاس

پڑا ہوا ہے عجب پردہ ہم پہ غفلت کا
یہ اہتمام اور اتنی سی زندگی کے لئے
جو مجھ سے پوچھئے بیدل تو یہ خراب آباد
نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

ان کے بعد جناب داغ اور حضرت مجروح میں ضد بحث ہونے
لگی کہ کون پہلے پڑھے، داغ نے کہا کہ حروف تہجی کے لحاظ سے
میرا حق پہلے ہے، ان کے آگے بیچارے مجروح کی ایک نہ چلی۔

حضرتِ داغ آگے بڑھے اور مولانا حالی اور امیر مینائی سے اجازت چاہی دونوں نے کہا بسم اللہ شروع کیجئے۔

غیر ہو ناشاد کیوں کیسی کہی
چاہتا ہوں داد کیوں کیسی کہی

مطلع پر حسب دلخواہ داد ملی۔ امیر مینائی نے کہا واہ کیا بیساختگی ہے

پہلے گالی دی سوالِ وصل پر
پھر ہوا ارشاد کیوں کیسی کہی

پیر زن کے ساتھ بول اٹھی اجل
اس نے اے فریاد کیوں کیسی کہی

تم نے دل کی بات کیوں کیسی کہی
ہم نے یہ روداد کیوں کیسی کہی

عاشقوں کے قتل پر اتنی خوشی
آپ ہیں جلاد کیوں کیسی کہی

مانگتے تھے میرے ملنے کی دعا
وہ بھی دن ہیں یاد کیوں کیسی کہی

لیچلیں گے آج تجھکو اُن کے پاس
اے دلِ ناشاد کیوں کیسی کہی

حشر میں پوچھے گا کہکر سرگذشت
یہ کہانی یاد کیوں کیسی کہی

سن لئے وصلِ عدو کے تم نے شعر
یہ مبارکباد کیوں کیسی کہی

میں کروں تیری طرح تجھ پر ستم
اے ستم ایجاد کیوں کیسی کہی

دل لگایا اب تو ہم نے پند گو
ہرچہ بادا باد کیوں کیسی کہی

صید کر لو طائرِ جانِ رقیب
تم بنو صیّاد کیوں کیسی کہی

ہم نے تجھ سے آج اپنی آرزو
بے کئے فریاد کیوں کیسی کہی

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے

ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی

پہلا مصرعہ پڑھتے ہوئے ذرا آگے سرکے اور گھٹنا ٹیک مولانا حالی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا ہاتھ لا۔ انہوں نے سادگی سے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا، ان کا ہاتھ پکڑ دوسرا مصرعہ عجب رندانہ انداز سے پڑھا ساری محفل پھڑک اٹھی،

داغ تجھ کو باغ جنت ہو نصیب
خانماں برباد کیوں کیسی کہی

مقطع پڑھ کر اٹھنے ہی کو تھے کہ امیر مینائی نے آگے بڑھ ہاتھ پکڑ پھر وہیں بٹھا دیا اور کہا داغ صاحب ہم جیسے مینا پرستوں کی اوسوں سے پیاس نہیں بجھتی کچھ اور عطا ہو۔ حضرت داغ بات ٹالنے کو مولانا حالی پر ڈھل پڑے، کہنے لگے، مولانا آپ نے ترک عاشقانہ گوئی کیوں کیا اب بھی کچھ نہیں گیا ہے ہمارے رنگ میں آجائیے مولانا حالی نے جواب دیا

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تونے ہم کو چھوڑا

ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی

ان باتوں سے بات نہ ٹلنی تھی نہ ٹلی۔ داغ صاحب کو بہرصورت ایک اور غزل پڑھنی ہی پڑی،

آپ جن کو ہدفِ تیرِ نظر کرتے ہیں
رات دن ہائے جگر ہائے جگر کرتے ہیں

اور کیا داغ کے اشعار اثر کرتے ہیں
گدگدی دل میں حسینوں کے مگر کرتے ہیں

غیر کے سامنے یوں ہوتے ہیں شکوے مجھ سے
دیکھتے ہیں وہ اُدھر بات اِدھر کرتے ہیں

دیکھکر دُور سے درباں نے مجھے للکارا
نہ کہا یہ کہ ٹھہر جاؤ خبر کرتے ہیں

تھک گئے نامۂ اعمال کو لکھتے لکھتے
کیا فرشتوں کا بُرا حال بشر کرتے ہیں

ابھی غیروں سے اشاروں میں ہوئی ہیں باتیں
دیکھتے دیکھتے آپ آنکھوں میں گھر کرتے ہیں

در و دیوار سے بھی رشک مجھے آتا ہے
غور سے جب کسی جانب وہ نظر کرتے ہیں

ان سے پوچھے جو کوئی خاک میں ملتے ہیں کہاں
وہ اشارہ طرفِ راہ گذر کرتے ہیں

اک تو نشۂ مے اُس پہ نشیلی آنکھیں
ہوش اُڑتے ہیں جدھر کو وہ نظر کرتے ہیں

عشق میں صبر و تحمل ہی کیا کرتے ہم
یہ بھی کمبخت کسی وقت ضرر کرتے ہیں

غیر کے قتل پہ باندھے ہیں بہانہ ہے فقط
کھینچ کر اور بھی پتلی وہ کمر کرتے ہیں

حضرتِ داغ کو دلی کی ہوا خوب لگی
رات دن عیش سے جلسوں میں بسر کرتے ہیں

حضرت داغ کے بعد نواب احمد سعید خاں صاحب طالب نے پڑھنے پر اصرار کیا اور اہل محفل نے اجازت دیدی۔ انہوں نے ایک غزل پڑھی جس کے آخر میں بسم اللہ مجریہا و مرسٰاہا تھا۔ ہر شعر پر ایک

ذہ قدم آگے بڑھ جاتے تھے، اور پھر پیچھے آتے تھے۔ غزل ختم ہوگئی
پر اہل محفل ابھی تشنہ تھے اور ایک اور کے طالب مولانا حالی اور امیر
مینائی کے اصرار پر دوسری غزل شروع کی جس کا مطلع تھا۔

معشوق وہ جو شوخ بھی ہو نازنیں بھی ہو
اور حسن اتفاق سے سب میں حسیں بھی ہو

اب مجروح اور امیر مینائی باقی بچے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت
مجروح پہلے عطا فرمائیں۔
انہوں نے کہا حضرات ملاحظہ ہو۔ مطلع عرض کرتا ہوں

اگر ہے بر سر مہر آسماں ہو
کبھی وہ بھی تو ہم پر مہرباں ہو

ملا دیتے یونہیں کچھ ہاں میں ہاں ہو
یہاں ہو پر خدا جانے کہاں ہو

یہ شعر بار بار پڑھوایا گیا۔ مولانا حالی نے جھوم جھوم کر داد دی

تمہارا شکوہ اور میری زباں سے
معاذ اللہ کتنے بدگماں ہو

علاجِ دردِ دل ممکن ہے لیکن

زباں کو بھی جو یارائے بیاں ہو

وہ ہے اپنا ہی گلزارِ تمنا

جہاں فصل بہاری میں خزاں ہو

لکھوں گر اضطرابِ دل کا مضموں

تو بے قاصد کے خط اپنا رواں ہو

اس شعر پر امیر مینائی نے بہت داد دی اور کہا واہ کیا نازک خیالی ہے۔

ہمیں شکوہ ہے اک بیداد گر کا

اب اس میں آپ ہوں یا آسماں ہو

تمام اہلِ محفل اس شعر پر لوٹ لوٹ گئے۔ مکرر اور سہ کرر پڑھواتے تھے۔ مولانا حالی نے کہا۔ مجروح صاحب دل چاہتا ہے تمام عمر یہ شعر سنتا رہوں، کیا بیان ہے اور کیا زبان۔ یہ خداداد بات ہے۔

ع - ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔

نہیں ملتے ہو پر ہو مطلبِ دل

اگر ہو بے وفا پر میری جاں ہو
عجب جا ہے جہانِ عشق بازی
جہاں نام و نشاں جا کر نشاں ہو
یہ بے پر خار خارِ دل سے خوش ہے
اسی سے تا بنائے آشیاں ہو
ہماری تلخ کامی کو نہ کھویا
یونہی کہنے کے تم شیریں زباں ہو
زمین و آسماں کی برہمی کو
تمہارا حسن اور میری فغاں ہو
دل ایسے شوخ پر فن کا ہے طالب
شرارت جس کے چہرے سے عیاں ہو
ٹپکتی ہو لگاوٹ چتونوں سے
حیا کچھ نیچی نظروں میں نہاں ہو

اس قطعہ پر حضرت داغ نے کہا۔ مجروح صاحب ان باتوں سے رقابت ہو جائے گی مجھے بھی ایک ایسے ہی کی تلاش ہے۔ مجروح نے کہا جس

ی طلب صادق ہوگی اس کو مل رہے گا۔ اس میں تکرار کی کیا بات ہے

مجھے مجروح کیا دیر و حرم سے
یہ سر ہو اور اس کا آستاں ہو

مقطع پڑھ اپنی جگہ پر ہو بیٹھے، اب سب کی نظریں امیر مینائی کی طرف تھیں۔ انہوں نے جیب سے کاغذ نکالا، عینک لگائی اور اجازت چاہی۔ مولانا حالی و دیگر شعرا نے کہا عطا ہو،

تصور ایک بحر حسن کا یوں ہے مرے دل میں
رواں رہتا ہے دریا جس طرح آغوشِ ساحل میں

مطلع پر حسب دلخواہ داد ملی، داغ نے کہا۔ نئی تشبیہ ہے۔ بڑی کاوش کے بعد حاصل ہوئی ہوگی۔

ہوائے زلف جاناں نے نہ چھوڑا مر کے بھی پیچھا
قیامت میں بھی ہم جکڑے ہوئے آئے سلاسل میں

شراب سرخ شیشے میں نہیں ہے یار اے ساقی
بھرا ہے خون بسمل یہ گلوئے مرغِ بسمل میں

یہ شعر حضرت مجروح نے کئی بار پڑھوایا اور بہت داد دی۔

تمنائے شہادت میں نہ مر کر بھی ہوئی راحت
تڑپ کر خلد سے پھر آ رہا ہیں کوئے قاتل میں
ترا خالِ ذقن دیکھا تو ہم کو یہ خیال آیا
فرشتوں کی جگہ ہے قیدِ زہرہ چاہ بابل میں
کیا جوہر مجھے جس دم نکھر کر روبرو آیا
بجائے تیغ آئینہ ہے لازم دستِ قاتل میں
رہِ صحرائے ہستی کو یہ آسانی سے کاٹے گا
تری تلوار کا دم آگیا ہے تیرے بسمل میں
جگہ تربت ہی کی تھوڑی سی ملے بعدِ فنا ہم کو
فلک میرا بھی حق ہے کچھ زمینِ کوئے قاتل میں
یہ کس کی نوک مژگاں کا تصور آنے والا ہے
کھٹک جاتا ہے اک کانٹا سا جو ہر دم مرے دل میں
نکالے رنگ گو چاہل نہیں پر قابل صحبت
طلب ہوتا ہے کب طاؤس بہر رقصِ محفل میں
تڑپتے ہیں کہ شوق قتل میں یہ رقص کرتے ہیں

تماشا بسملوں کا ہو رہا ہے کوئے قاتل میں
یہ کیوں گھبرا رہے ہیں کچھ سبب اس کا نہیں کھلتا
کبھی جاتے ہیں آنکھوں میں کبھی آتے ہیں وہ دل میں
چھری کو تیز اے صیاد اب تک بے قراری ہے
کوئی رگ رہ گئی ہے کیا گلوئے مرغ بسمل میں
تقاضا جاں نثاری کا یہ ہے ایذا نہو اس کو
خوشی سے کاٹ کر سر اپنا رکھ دیں دست قاتل میں
ہزاروں قیس مشرب ساتھ پھرتے ہیں بیاباں میں
مرے دل میں خیال یار یا لیلےٰ ہے محمل میں
کبھی غمزہ اگر تیغ نگہ کو روک لیتا ہے
تو پلکوں کے چبھو جاتے ہیں وہ نشتر مرے دل میں
جہاں ظلمت تھی میرے گر شب فرقت سمٹ آئی
دھوئیں کا نام اب باقی نہیں ہے چاہ بابل میں
بمشکل ضعف میں پہنچا ہوں میدان شہادت تک
جانے دے قدم اے درد پہلو، کوئے قاتل میں

عروسِ مرگ تیری تیغ کا منھ چوم لیتی ہے
نکلتی ہے لگا کر جب یہ غوطہ خونِ بسمل میں

نکل جائے ترا تیر آ کے پہلو سے یہ کیا ممکن
ابھی اے ترک اتنی جان باقی ہے مرے دل میں

اس شعر پر بہت داد ملی۔

امیرؔ اب تک نہیں کھلتے جو اس کی تیغ کے جوہر
توقف کیوں ہے کیا مہندی لگی ہے دستِ قاتل میں

مقطع پڑھنے کے بعد اسی ردیف قافیہ میں دوسری غزل شروع کی

کسی زہرہ شمائل کا تصور ہے مرے دل میں
منجم یا قمر کا ہے گذر خورشید منزل میں

قدم رنجہ تو فرماؤ کوئی رہنے نہ پائے گا
نکل جائیں گی جتنی آرزوئیں ہیں مرے دل میں

اس شعر پر حضرتِ داغ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور کہا واہ! کیا خوب فرمایا ہے۔ امیر مینائی آداب بجا لائے اور کہا جناب کی ذرّہ نوازی ہے۔

رچے گی خوب اے قاتل غضب کا رنگ لائے گی
منگائی ہے جو مہندی پیس اس کو خونِ بسمل میں

نہیں کرتا کبھی پروائے جنت اے گلِ خوبی
نہایت پائی ہم نے بے نیازی تیرے سائل میں

یہی حیرت کا عالم ہے تو نظارہ کہاں مجنوں
نکل بھی آئے محمل سے تو پھر لیلیٰ ہے محمل میں

دوئی اُٹھ جائے تو جھگڑا کہاں شیخ و برہمن کا
بت آئیں سجدے کرتے شوق سے اس کعبۂ دل میں

تڑپتا ہے دل صیاد بھی اس کے تڑپنے پر
قیامت کا اثر ہے اضطرابِ مرغ بسمل میں

یہ بیماری محبت کی کوئی نیرنگ ہے اے دل
جہاں آیا مسیحا درد دونا ہو گیا دل میں

وہانِ زخم نے کس کس مزے سے اس کو چوسا ہے
لب شیریں کی لذت ہے زبانِ تیغ قاتل میں

جدا ہوتی نہیں گردن سے قاتل زور کرتا ہے

زبان تیغ نے لذت یہ پائی خونِ بسمل میں

ذرا محمل سے ہٹ کر خاک اڑا او بے ادب مجنون
خیال اتنا تو کرنا چاہیئے ہے کون محمل میں

کرامت ہے کوئی ساقی کہ تیری چشم میگون ہے
چھکایا ایک پیمانے سے تونے سب کو محفل میں

لگا کر وار اوچھا پھر نہ دیکھا اس طرف تم نے
قضا روتی رہی بیٹھی ہوئی پہلوئے بسمل میں

اجازت چاہتی ہے کس سے پروانوں کے آنے کی
کھڑی ہے عرض بیگی کی طرح جو شمع محفل میں

نہ آمادہ ہوا ہو کوئی عمزہ اس کا شوخی پر
الٰہی خیر بجلی سی چمکتی ہے مرے دل میں

امیر اُس کی تجلی گاہ ہے دنیا جو آنکھیں ہوں
وہی گل ہے گلستاں میں وہی ہے شمع محفل میں

غزل کے ختم ہونے پر سب نے پھر داد دی۔ حضرتِ داغ
نے کہا ایک مرتبہ وہ آرزوں والا شعر پھر فرمادیجیے۔ امیر مینائی نے

کہا بہت خوب اور دوبارہ یہ شعر پڑھا۔

قدم رنجہ تو فرماؤ کوئی رہنے نہ پائے گا
نکل جائیں گی جتنی آرزوئیں ہیں مرے دل میں

دلّی ماتا نے ایک مصاحب کی طرف دیکھا اور کہا کل کی صورتیں نہیں نظر آتیں، وہ لوگ کہاں گئے، جواب ملا تہ خاک۔ یہ سن جوگن جی اُٹھ کھڑی ہوئیں سب نے تعظیم دی۔ صاحب خانہ دروازہ تک چھوڑنے آئے۔

رات کے دو بجے ہیں۔ ہر سمت سکوتِ مرگ طاری ہے۔ چشم فلک سے شہاب ثاقب آنسو بن بن کر ٹپک رہے ہیں۔ دلّی ماتا اپنی کٹی میں جا پڑیں۔ ساتھیوں نے بھی اپنے اپنے گھر راہ لی۔

رہے نام سائیں کا
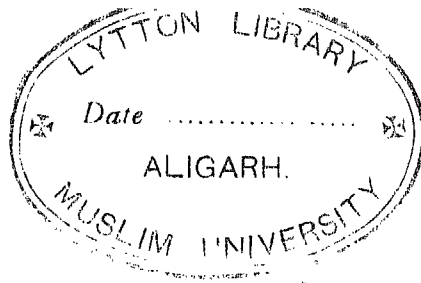
رفتارِ زمانہ

از خواجہ عبدالمجید دہلوی

خواجہ صاحب کی اُن تقاریر کا مجموعہ جو دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہو چکی ہیں۔ دہلی کی قدیم ٹکسالی زبان میں تہذیبِ جدید کا خاکہ نہایت دلکش انداز میں کھینچا گیا ہے۔ زبان کا لطف، افسانے کی دلکشی اور انداز بیان کی جاذبیت قابلِ دید ہے۔

قیمت ۱۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

م ورشش 920.5.8686

(دسمبر)

۳۳۰۰۱۸

Date	No.	Date	No.